یاد ایام

اسلامی برکات بذریعہ احمدیت

میر غلام احمد نسیم

ایم اے - ایم - او - ایل

مربی سلسلہ پروفیسر جامعہ احمدیہ

15۔اگست 1931ء میں پیدا ہوا۔1947ء میں خدمت دین کے لئے زندگی وقف کی۔جامعہ احمدیہ میں دینی تعلیم کی تکمیل پر 1957ء میں شاہد کی سند حاصل کی اور میدان عمل مین قدم رکھا۔1965ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی کی سند حاصل کی۔مولوی فاضل اور بی۔اے (پورے مضامین) ہونے کی بنا پر ایم۔او۔ایل (ماسٹر آف اورینٹل لینگوجز) کی اعزازی ڈگری کا حقدار قرار پایا۔

خدمت دین کے عملی کام اور کچھ عرصہ تدریسی کے کام کے ساتھ علمی کام کا عملی مشغلہ جاری رہا اور بیسوں مضامین جماعت کے اخبارات رسائل اور جرائد میں شائع ہوتے رہے۔بیرون پاکستان قیام کے دوران انگریزی زبان میں لکھے گئے مضامین وہاں کے اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔

تالیفات میں قاموس الرویا اور تصوف یعنی روحانی سائنس علاوہ تالیف ھذا کے شامل ہیں

یاد ایّام

اسلامی برکات بذریعہ احمدیت

خاندان کا مختصر تعارف، میدان عمل کے چند دلچسپ واقعات و واردات
کا تذکرہ اور پیش آمدہ بعض غیر معمولی مشکلات میں خدا تعالیٰ کی تائیدات سے ان پر
قابو پانے کا مختصر ذکر۔

میر غلام احمد نسیم ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل
مربی سلسلہ احمدیہ
واستاد (پروفیسر جامعہ احمدیہ ربوہ)

نام کتاب : یادایام

تصنیف : میر غلام احمد نسیم ایم اے، ایم او ایل

کمپوزنگ : دی کمپوزرز (کمپیوٹر سرجنز) ربوہ
www.thecomposers.biz

سن کمپوزنگ : دسمبر 2007ء

ناشر : ڈاکٹر میر مقبول احمد (امریکہ)

مطبوعہ: لاہور آرٹ پریس
15 انارکلی لاہور

ملنے کا پتہ: جمال الدین انجم
احمد اکیڈمی (ربوہ)
حیات مارکیٹ گولبازار
Ph: 047-6214777

فہرست مضامین

بسم الله الرحمان الرحیم

باب اول

حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کا فرمان

''اپنے اپنے خاندانوں کی تاریخ زندہ رکھیں اور اپنے خاندانوں کی تاریخ احمدیت سے شروع کریں۔یعنی وہ کب احمدی ہوئے۔پھر انہوں نے کیا کیا قربانیاں کیں،کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر کیا کیا فضل فرمائے۔یہ ساری سچی کہانیاں ہیں اور بڑی دلچسپ اور دردناک بھی ہیں۔یہ ساری باتیں یاد رکھو گے تو زندہ رہو گے ورنہ مٹی میں مل جاؤ گے اور اگلی نسل کو پتہ ہی کوئی نہ ہو گا کہ کن کی نسل ہیں۔کہاں سے آئے ہیں ان کی کیا نیک روایات ہیں۔''

(ہفت روزہ 'الفضل انٹرنیشنل' لندن 7 جون 1996ء

1- پہچان

''اے لوگو! یقیناً ہم نے تمہیں نر اور مادہ سے پیدا کیا ہے اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بلاشبہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے...... '' (49:14)

ہمارا خاندانی تعلق اقوام کشمیر میں سے میر قوم سے ہے اور میر کشمیری سید بھی ہیں اور امیر زادے یا مرزا بھی ہیں۔ اس میں امتیاز کے لئے عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ اگر لفظ ''میر'' نام سے پہلے لکھا جائے تو مراد سید ہوگا لیکن اگر بعد میں لکھا جائے تو میر کا امیر یا مرزا سے تعلق ہونا سمجھا جائے گا۔ یہ اصول عمومی طور پر درست ہوگا مگر صد فی صد درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ برصغیر پاک و ہند میں یہ تعارفی لفظ اکثر خاندانوں کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ بلوچستان اور سندھ میں ایسے اکثر خاندان ہیں جن کے نام کے ساتھ میر استعمال ہوتا ہے حالانکہ وہ سید نہیں ہیں۔ دہلی اور دہلی کے مضافات میں نام کے شروع میں اگر یہ استعمال ہو تو عموماً اس سے مراد سیّد ہوتی ہے لیکن وہاں بھی غالباً سو فیصد اس کا استعمال سیّد کے لئے مختص نہیں بلکہ کسی مشہور و معروف انسان یا مشہور خاندان کے لئے استعمال ہونے کا امکان بھی موجود ہے۔ ہم یہاں اپنے خاندانی تعلق کی وجہ سے ''اقوام کشمیر میں میر قوم کا مقام'' کے عنوان کے تحت مختصر تعارف تاریخ کے حوالے سے پیش کر رہے ہیں۔ تاہم اس سے مراد فخر یا کوئی خاص امتیاز ظاہر کرنا نہیں بلکہ محولہ بالا قرآنی آیت کے مطابق صرف اور صرف ''پہچان'' مقصود ہے۔

3- اقوام کشمیر میں 'میر قوم' کا مقام

اگر نام سے قبل ''میر'' کا لفظ استعمال ہو تو مسمّٰی سیّد سمجھا جائے گا جیسے 'میر حسن شاہ' اگر بعد میں استعمال ہو تو مسمّٰی 'مغل' ہوگا جیسے 'اختر میر' 'غفار میر' وغیرہ۔ اس قوم کے لوگ شاہانِ مغلیہ کے زمانہ میں کشمیر آئے۔

ایک دوسری تحقیق کے مطابق 'میر' ایک ایرانی لقب ہے جو عربی لفظ 'امیر' کا مخفف ہے اور معنوی لحاظ سے نہ صرف 'امیر' بلکہ میرزا کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ امیر کی طرح 'میر' ملوک کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ 'منوچہری' طبع 1882ء کے صفحہ 92 پر محمود غزنوی کے لئے 'میر' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ 'میر' بطور لقب شعراء اور دوسرے اہل قلم کے لئے بھی استعمال ہوا ہے جیسے میر علی شیر، میر محسن وغیرہ تاہم اس کی وجہ شائد یہ نہ تھی کہ یہ لوگ اہل قلم تھے بلکہ ان کے 'میر' کہلانے کی غالباً یہ وجہ تھی کہ وہ طبقہ امراء سے تعلق رکھتے تھے۔ ہندوستان میں سادات بھی بعض اوقات یہ لقب اپنے نام سے پہلے استعمال کرتے ہیں جیسے 'میر تقی میر'۔ لفظ 'میر' بطور نکرہ 'صاحب' کے مترادف ہے مثلاً میر پنج، میر آخور۔

ترکی زبان کی بول چال میں، 'میری' کا لفظ بمعنی حکومت سے متعلق استعمال میں آیا ہے اور اسی سے 'المیری' کی ترکیب وضع ہوئی ہے جو عراق کی عوامی بول چال میں رائج ہے۔

ایک اور تحقیق کے مطابق کشمیری سیّد دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو مذہبی پیشوا ہیں اور ان کا کام ہی مذہبی پیشوائی ہے اور دوسرے وہ ہیں جنہوں نے زراعت کو بطور پیشہ اپنا لیا ہے یا دوسرے پیشوں میں لگ گئے ہیں ان کا اعزازی نام 'میر' ہے۔ اگر سادات نے اپنا اصل پیشہ یعنی مذہبی پیشوائی برقرار رکھی ہے تو اس کے نام سے قبل لفظ 'میر' استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس نے زراعت یا کوئی اور پیشہ اختیار کر لیا ہے تو 'میر' کا حصہ اس کے نام کے بعد استعمال ہوگا جیسے سبحان میر وغیرہ۔

ایک دوسری تحقیق بتاتی ہے کہ کشمیری مغل بھی 'میر' لقب سے یاد کئے جاتے ہیں اور یہ لفظ دراصل مرزا کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ میر مغل زراعت پیشہ ہیں۔ 27 جنوری 1932ء کو سب جج سیالکوٹ نے ایک عدالتی فیصلہ میں تحریر کیا۔

''اب ہمیں دیکھنا ہے کہ لفظ 'میر' سے کیا مراد لی جاتی ہے۔ اگر لفظ 'میر' کسی نام کے شروع میں لگا دیا جائے تو یہ ایک معزز خطاب ہے۔ ہاں اگر یہی لفظ کسی نام

کے بعد میں آ جائے تو اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ مرزا کا مخفف ہے جو مغل کا معزز خطاب ہے۔"

رپورٹ مردم شماری سن 1911ء میں صفحہ 126 پر لکھا ہے کہ مغلوں کی چھ گوتیں ہیں بیگ، چوغط، میر، وغیرہ اور جلد اول کے صفحہ 205 کے حاشیہ میں مغلوں کی سات گوتیں بتائی گئی ہیں جن میں 'میر' کا ذکر ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ 'میر' یعنی مغل زراعت پیشہ ہیں۔"

اسی طرح ڈسٹرکٹ گجرات کا ایک فیصلہ بھی اس قسم کا ہے اس میں بھی تحریر ہے کہ 'میر' مغل ہیں اور ان کا پیشہ زراعت ہے۔

کشمیر اور پنجاب میں لفظ 'میر' نے قوم مغل اور سادات میں جو فرق اور امتیاز قائم کر رکھا تھا اس کو اب دونوں جگہ ختم کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ میر بمعنی مغل جو اقوام تھیں اور جن کی پہچان یہ تھی کہ میر کا لفظ ان کے نام کے آخر میں آتا تھا اب وہ بھی شروع ہی میں میر کا لفظ لکھ رہی ہیں اور ہر چند ایسے قبائل کو سیادت کا دعویٰ نہیں:......"

(تاریخ اقوام کشمیر از محمد دین فوق و اردو دائرۃ المعارف جلد 21 زیر لفظ میر)

تاریخ گلشن کشمیر (غیر مطبوعہ) میں میر قوم کی اصلیت کو میرزا یا امیر ظاہر کر کے لکھا ہے کہ یہ لوگ مغل ہیں......"

وسط ایشیائی اور روسی زبان میں ایک لفظ "ولادی میر" (Vladimir) استعمال ہوتا ہے جس کے معانی دنیا پر حکمرانی کرنے کے ہیں۔ ممکن ہے کہ لفظ 'میر' اسی لفظ کی بدلی ہوئی اور تخفیف شدہ صورت ہو۔ کیونکہ برصغیر میں جو اقوام اپنے تعارف کے لئے اسے استعمال کرتی ہیں وہ وسط ایشیا سے ہی نقل مکانی کر کے آئی ہوئی ہیں۔ ان کا تعلق وسط ایشیا سے ہی ہے۔ اور چونکہ مرور زمانہ کے ساتھ زبانوں میں تبدیلی اور کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اس لئے ممکن ہے کہ لفظ "ولادی میر" میں تبدیلی ہو کر صرف 'میر' رہ گیا ہو۔ زبانوں میں تبدیلی اور ردوبدل اور کمی بیشی ہونا ایک تسلیم شدہ امر ہے۔

4- اباؤ اجداد

ہمارے اباؤ اجداد وادی کشمیر سے نامعلوم وجوہ کی بنا پر نقل مکانی کر کے علاقہ پونچھ میں آباد ہو گئے تھے۔ اگرچہ پونچھ بھی ریاست جموں و کشمیر کا حصہ ہے لیکن ان دونوں علاقوں میں زبان کا اختلاف ہے۔ وادی کشمیر میں کشمیری زبان بولی جاتی ہے جبکہ جہاں ہم پیدا ہوئے وہاں 'پہاڑی زبان' جو پنجابی زبان سے ملتی جلتی ہے بولی جاتی ہے۔ لباس اور رہن سہن میں بھی کسی قدر اختلاف ہے۔ مَیں نے بچپن میں رشتہ کی ایک دادی کو اس کے (قدیمی) اصل لباس میں دیکھا تھا وہ زبان بھی خالص کشمیری بولتی تھیں۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کو آبائی وطن چھوڑے صدیاں نہیں بیتی ہوں گی۔ جس گاؤں میں انہوں نے نقل مکانی کے بعد سکونت اختیار کی اس کا نام سنگھیوٹ ہے۔ ہمارے دادا جان جمال الدین اسی گاؤں میں سکونت پذیر تھے۔ سنگھیوٹ کے ملحق ہی "دھوڑیاں بہاٹہ" نامی گاؤں ہے جہاں بعد میں ہمارے والد میر صلاح محمد صاحب نے سکونت اختیار کر لی تھی۔ والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ وہ سات بھائی تھے۔ کچھ ان سے عمر میں بڑے اور کچھ چھوٹے۔ جب انہوں نے احمدیت قبول کی تو اس وقت ان کی عمر سولہ یا سترہ سال تھی۔ بڑے بھائیوں میں سے ایک آدھ نے اور اسی طرح بعض خاندان کے بزرگوں نے کم عمر اور ناسمجھ کہہ کر نظر انداز کر دیا لیکن بعض نے اذیتیں دینی شروع کر دیں۔ جس پر انہیں آبائی گھر چھوڑنا پڑا۔ والد صاحب یہ بھی بیان کیا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ مولوی صاحب کو ان کا بڑا بھائی بلا لایا کہ یہ ہمارا چھوٹا بھائی کہتا ہے کہ امام مہدی کا ظہور ہو چکا ہے۔ کیونکہ دیگر علامات کے علاوہ چاند اور سورج کو پیشگوئیوں کے مطابق گرہن لگ گیا ہے۔ جب مولوی نے دیکھا تو کہنے لگا یہ تو بچہ ہے اور ناسمجھ ہے بڑا ہو کر راہِ راست پر آ جائے گا۔ اسے ابھی کچھ نہ کہو۔

جب ہم نے ہوش سنبھالا اس وقت بعض ہمارے تائے اور چچے وفات پا چکے تھے۔ ایک تایا حیات محمد جنہیں عرف عام میں "حاتہ" کہہ کر پکارتے تھے وہ زندہ تھے اور شدید مخالفت کرتے تھے۔ تین چچے غلام رسول، غلام محمدؐ اور عبدالغفار بقید حیات تھے۔ ان میں سے غلام رسول تو برصغیر کی تقسیم سے قبل ہی وفات پا گئے تھے اور دوسرے دو تقسیم کے وقت ہجرت کر کے آزاد کشمیر میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔

5- میاں صلاح محمد صاحب (تعارف)

خاندانی روایات کے مطابق میاں صلاح محمد صاحب کے آباؤاجداد موضع ''کریر''، ''ضلع بارہ مولا کشمیر'' سے نقل مکانی کر کے پونچھ کے علاقہ میں آئے اور موضع ''سنگہیوٹ''، تحصیل مہنڈر ضلع پونچھ میں آباد ہوئے۔ غالب امکان یہ ہے کہ آپ کے دادا یا پڑدادا نے نقل مکانی کی ہوگی۔ کیونکہ 1940ء میں ہماری رشتہ میں ایک دادی کشمیر زبان میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے خود دیکھی اور سنی۔ وہ لباس بھی خالص وادی کشمیر کا زیب تن کرتی تھی۔

نام ونسب:

آپ کا نام صلاح محمد (عرف سلہ) تھا اور آپ کے والد کا نام جمال الدین تھا۔ خاندانی طور پر 'میر' خاندان سے ہیں۔ یہ ایک مشہور کشمیر قوم ہے جس کا تفصیلی ذکر اوپر بیان ہو چکا ہے۔

تاریخ اور جائے پیدائش:

آپ 1296ھ /1880ء یا 1298ھ /1881ء میں بمقام موضع سنگہیوٹ تحصیل مہنڈر ضلع پونچھ، ریاست جموں وکشمیر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے بچپن کے حالات اور ابتدائی حصول تعلیم کے تفصیلی حالات پردہ اخفاء میں ہیں۔ البتہ اس قدر معلوم ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی اور پھر مسجد کے مکتب میں کلام پاک کی باقاعدہ تدریس شروع کی اور ساتھ ہی اردو زبان سیکھنے کے لئے بنیادی اسباق کا آغاز بھی ہوا۔

آپ کو بچپن سے ہی مذہب سے رغبت تھی۔ غالباً اسی بنا پر آپ کے والد صاحب نے آپ کو ایک ایسے معلم کے پاس بھیجا جو مذہب سے شغف رکھتا تھا۔ اس معلم سے آپ نے قرآن مجید کی تدریس کے ساتھ ہی بعض ابتدائی مذہبی مسائل سے متعلق کتب پڑھیں اور مذہب کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کئے اور اس طرح مذہبی تعلیم کا آغاز ہوا۔ کچھ عرصہ بعد گھر کے کام کاج اور مصروفیات کی بنا پر مکتب چھوڑنا پڑا۔ لیکن پھر بھی وقتاً فوقتاً وقت نکال کر اپنے استاد کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنے علم میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

قبول احمدیت:

صاف دل کو کثرتِ اعجاز کی حاجت نہیں
اک نشاں کافی ہے گر دل میں ہے خوفِ کردگار

(براہین احمدیہ پنجم صفحہ 121)

دھوڑیاں بھانہ ایک پہاڑی گاؤں ہے جو وسیع وعریض رقبہ پر مشتمل ہے۔ مکان ایک دوسرے سے دو جہاں کسی کی موروثی یا ملکیتی اراضی ہے، پر بنے ہوئے ہیں۔ چند کنال زمین، چند مویشی اور ایک آدھ مختصر مکان وہاں کے مکینوں کا کل اثاثہ ہوتا ہے۔ ہمارا گھر گاؤں کے انتہائی شرقی کنارے پر ایک دوسرے گاؤں سنگہیوٹ سے ملا ہوا ہے۔ والد ماجد میاں صلاح محمد دراصل سنگہیوٹ کے ہی رہنے والے تھے۔ ان کے بیان کے مطابق جب وہ گاؤں کے مکتب میں زیر تعلیم تھے اور اپنے استاد ''میاں منگا'' صاحؒ سے دینی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ ایک کتاب ''احوال الآخرت'' کا ذکر بھی اکثر ہوتا جس میں مصنف نے آخری زمانہ کے دگرگوں حالات کے ذکر کے ساتھ لوگوں کی اصلاح کے لئے ایک مہدی موعود کے ظہور کا ذکر بھی کیا ہوا تھا اور ساتھ ہی اس زمانہ کی علامات کا بھی ذکر تھا۔ کتاب منظوم تھی اور دورانِ درس استاد صاحب بعض پنجابی اشعار بھی پڑھتے۔ انہوں نے یہ بھی بیان کیا کہ امام مہدی کا ظہور قادیان میں ہو چکا ہے۔ قادیان ضلع گورداسپور، صوبہ پنجاب میں ایک قصبہ ہے۔ اور یہ کہ وہ اس سلسلہ میں تحقیق کر رہے ہیں۔

آپ قبول احمدیت کی وجوہات بیان کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ زمانہ طالب علمی میں دیگر کتب کے علاوہ ایک کتاب ''احوال الآخرت'' زیر مطالعہ آتی تھی اس میں امام مہدی کے چودھویں صدی ہجری میں ظاہر ہونے کا ذکر تھا۔ مہدی کی علامات ظہور میں سے دو علامتوں کا ذکر یوں کیا گیا تھا

تیرھویں چن ستھیویں سورج گرہن ہوسی اس سالے
اندر ماہ رمضانے للکھیا ایہہ ہک روایت والے

یہ کتاب برصغیر کے مشہور عالم 'مفسر قرآن حضرت حافظ محمد بن بارک اللہ جو کہ ''لکھوکے والے'' کے نام سے مشہور ہیں' کی تصنیف ہے۔ کتاب مذکورہ کے صفحہ 23 زیر عنوان ''بیان علامت کبری قیامت کہ اول ظہور محمد مہدی است'' پر یہ شعر موجود ہے۔

آپ کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ استاد کی تحقیق بھی غالباً تکمیل کو پہنچ چکی تھی کہ حصول تعلیم کے دوران ہی 1318ھ/1901ء میں احمدیہ جماعت میں شمولیت کا شرف آپ کو حاصل ہوا۔ آپ کی وصیت کا فارم جو دفتر وصیت کے ریکارڈ میں موجود ہے اس سے احمدیت میں شمولیت کا یہ سال مذکور ہے۔ آپ کے چھ بھائی تھے جو عمر میں آپ سے بڑے تھے۔ ایک آدھ نے آپ کے احمدیت میں شامل ہونے پر شدید ردعمل کا اظہار کیا اور سخت مخالفت کی۔ چھوٹا بھائی ہونے کے ناطے سے دست درازی تک نوبت پہنچی۔ اپنی طرف سے وہ اپنے بھائی کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسی کشمکش کے دوران ایک مرتبہ آپ کو آپ کے سب سے بڑے بھائی نے دھکا دیا۔ آپ کا سر دیوار سے جا ٹکرایا اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

والدہ کا صائب مشورہ:

آپ کی والدہ بقید حیات تھیں انہیں بیٹے پر ترس آیا اور آپ کو ہوش میں آنے پر مشورہ دیا کہ ''یا تو احمدیت ترک کر دو یا پھر گھر چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ بصورت دیگر یہ ہوسکتا ہے کہ تمہیں جان سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں۔'' چنانچہ آپ والدہ کی اس صائب رائے پر گاؤں چھوڑ کر تحصیل راجوری میں واقعہ قصبہ چارکوٹ چلے گئے جہاں پہلے سے کچھ گھر احمدیوں کے موجود تھے۔ کچھ عرصہ وہاں قیام پذیر رہے۔ اس دوران حکومتِ وقت کی طرف سے کچھ غیر آباد علاقوں کو آباد کرنے کے منصوبے کا اعلان ہوا۔ اس اعلان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ نے موضع دھوڑیاں میں کچھ زرعی زمین حاصل کر لی اور اسے آباد کر کے وہاں قیام پذیر ہو گئے۔

ہمارے والد صاحب میر صلاح محمد جو اپنے علاقہ میں میاں صلاح محمد کے نام سے مشہور تھے کے احمدیت قبول کرنے کے بارے میں تاریخ احمدیت کشمیر کے صفحہ 77 پر لکھا ہے۔

''ایک دوست میر صلاح محمد صاحب دھوڑیاں ضلع پونچھ (کشمیر) سے تعلق رکھنے والے اس نشان (چاند سورج گرہن) کے متعلق گھر میں موجود کتاب احوال الآخرت اکثر پڑھتے اور چاند سورج گرہن 1311ھ/1894ء میں ظاہر ہونے کے بعد اس کی تلاش شروع کی کیونکہ اس کے مطابق امام مہدی کے انتظار میں تھے۔ آخر انہیں مدعی مہدویت حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام کے دعوی کا علم ہوا تو ایک

دوست میاں منگا صاحب (جو سنگھوٹ میں امامت اور تعلیم دین کا فریضہ انجام دیتے) سے تفصیلی ذکر کیا۔ چنانچہ ان کو غور وفکر کے بعد بیعت کی توفیق مل گئی۔ ان کے بعد میر صلاح محمد صاحب نے بھی قبولیت کی توفیق پائی۔ سوچ بچار میں کافی وقت گذر گیا اس لئے یہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کے دست مبارک پر بیعت نہ کر سکے۔''

(تاریخ احمدیت کشمیر صفحہ 77)

آپ قبول احمدیت کا واقعہ یوں بیان فرماتے کہ زمانہ طالب علمی کے دوران ہم ایک کتاب ''احوال الآخرت'' پڑھا کرتے تھے۔ اس میں امام مہدی کے چودھویں صدی ہجری میں ظہور کا ذکر تھا نیز ظہور کے وقت کی علامات بھی مذکور تھیں۔ جب 1311ھ/1894ء میں رمضان کے مہینہ میں سورج اور چاند گرہن کا نشان ظاہر ہوا تو ہمیں یقین ہو گیا کہ حضرت امام مہدی کا ظہور ہو چکا ہے چنانچہ آپ اور آپ کے ایک اور دوست 'میاں منگا صاحب' 'لوہار کے والے' نے تلاش شروع کر دی۔ اسی اثنا میں مولوی عبدالرحمان صاحب جو وادی کشمیر کے موضع ناسنور کے رہنے والے تھے قادیان سے ہو کر راجوری کا دورہ کرتے ہوئے ادھر سے گذرے اور مختلف مقامات پر تقریریں کیں۔ ان کی تقاریر نے لوگوں پر کافی اثر کیا۔ چنانچہ ایک شخص قاضی اکبر جو موضع رہتال متصل شہر راجوری کے رہنے والے تھے احمدیت میں داخل ہوئے۔ ان کے ذریعہ بعد میں اس علاقہ میں متعدد جماعتیں قائم ہوئیں۔ انہی کے ذریعہ وہ اور ان کے دوست 'میاں منگا' بھی بیعت کر کے سلسلہ میں داخل ہوئے۔ ہر دو نے بیعت بذریعہ تحریر کی۔ بعد میں دستی بیعت کے لئے میاں منگا صاحب نے قادیان جانے کے لئے سفر اختیار کیا مگر سواری کا مناسب انتظام نہ ہونے کی وجہ سے منزلِ مقصود پر نہ پہنچ سکے اس زمانہ میں رسل و رسائل کا انتظام عام نہ تھا۔ پیدل ہی جب وہ جموں سے ہوتے ہوئے پٹھانکوٹ پہنچے تو بیمار ہو گئے اور واپس لوٹ آئے۔

اسی زمانہ میں ایک اور احمدی مولوی محبوب عالم صاحب چک پرانا ضلع گجرات سے گوئی ضلع پونچھ میں جا کر رہائش پذیر ہوئے انہوں نے بھی دعوت الی اللہ اور درس و تدریس کا سلسلہ اس علاقہ میں شروع کیا۔ ان کی مساعی کے نتیجہ میں اس علاقہ میں بھی بعض جماعتیں قائم ہونا شروع ہوئیں۔ آپ کا میل ملاپ ان سے اکثر ہوتا جو آپ کی احمدیت میں پختگی اور دینی تعلیم و تربیت میں ترقی کا موجب ہوا۔ مولوی محبوب عالم کی دعوت الی اللہ کی مساعی کے نتیجہ میں اس علاقہ میں جو جماعتیں قائم ہوئیں ان میں سے قابل ذکر سلواہ،

ٹائیں اورشیں درہ کی جماعتیں ہیں۔ سلواہ جماعت کی قابل ذکر شخصیت مولوی عبدالحی صاحب تھے جن سے کم عمری میں ہمیں بھی شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ انہیں علاقہ میں علم کی روشنی پھیلانے کا بہت شوق تھا۔ قرآن مجید اور دیگر اسلامی کتب کی تدریس کے لئے انہوں نے اپنے گھر کو مکتب بنا رکھا تھا۔ دور دراز علاقوں سے بھی علم کے پیاسے طلبہ ان کے ہاں پہنچ کر دینی تعلیم حاصل کرتے یہ کام وہ کسی دنیوی منفعت کے لئے نہیں کرتے تھے بلکہ محض رضاء الٰہی غرض تھی۔ ان کے قوت لایموت کے ذرائع دوسرے موجود تھے۔

حضرت میاں صلاح محمد صاحب ان معنوں میں رفقاء حضرت مسیح موعودؑ میں شامل تھے کہ آپ نے حضرت مسیح موعود کے زمانہ میں یعنی 1318ھ/1901ء میں احمدیت قبول کی مگر دور دراز علاقہ میں رہنے کی وجہ سے باوجود انتہائی کوشش کے حضور کی زیارت نہ کر سکے۔ علاقہ پونچھ اور راجوری میں احمدیت کی دعوت اور اس کے خاطر خواہ نتائج میں آپ کی کوششوں کا خاصہ دخل ہے۔ ایک نڈر احمدی اور بغیر خوف کے حق کو ہر چھوٹے بڑے کے سامنے پیش کرنے کی وجہ سے علاقہ میں آپ کو خاص شہرت حاصل تھی۔ سلسلہ کی طرف سے جب بھی کوئی تحریک ہوتی سب سے پہلے اس میں حصہ لینے کی کوشش کرتے۔ تحریک وقف جائیداد اور تحریک جدید میں بھی حصہ لیا۔ خود موصی تھے دوسروں کو بھی وصیت کرنے کی ہمیشہ تلقین کیا کرتے تھے۔

مخالفت کا آغاز:

جب آپ نے احمدیت اختیار کی تو آپ کے اپنے خاندان اور سارے علاقہ میں مشہور ہو گیا کہ آپ نے 'نعوذ باللہ' کوئی نیا مذہب اختیار کر لیا ہے۔ آپ کے خلاف علاقہ کے مولویوں کے فتوے لئے گئے اور اپنوں اور بیگانوں سب نے مل کر آپ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا اور مخالفت کا ایک محاذ قائم ہو گیا حتیٰ کہ آپ کے حقیقی بھائیوں نے مجبور کر دیا کہ آپ اپنے گھر اور گاؤں سے ہجرت کر جائیں۔ اسی دوران قاضی اکبر صاحب جن کا ذکر گزر چکا ہے کی دعوت حق کی مساعی سے ان کی برادری کے اکثر افراد احمدی ہو چکے تھے اور موضع چارکوٹ میں اچھی خاصی جماعت قائم ہو چکی تھی۔ آپ جھگڑے اور فساد سے تنگ آ کر چارکوٹ چلے گئے اور کچھ عرصہ وہیں قیام پذیر رہے۔ اس دوران آپ کے بھائیوں نے فتویٰ حاصل کر لیا کہ 'نعوذ باللہ' آپ دائرہ اسلام سے خارج ہو گئے ہیں اور جو دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے اس کو وراثت میں سے حصہ نہیں ملتا۔ بھائیوں نے کہا کہ احمدیت کو چھوڑ دو ورنہ جدی وراثت سے حصہ نہیں ملے گا۔ آپ

نے جواب میں کہا کہ جس بات کو میں نے حق اور خدا کی طرف سے سمجھ کر اختیار کیا ہے اس سے کیسے دستبردار ہو سکتا ہوں۔ یہ ایمان کا معاملہ ہے اس کا تعلق بلا واسطہ خدا تعالیٰ سے ہے۔ اگر آپ جائیداد سے محروم کر دیں گے تو کوئی بات نہیں میرا خدا زندہ ہے وہ معاش کی کوئی اور صورت پیدا کر دے گا۔

الٰہی نصرت:

اسی دوران حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ حکومت کچھ بنجر اور غیر آباد علاقوں کو آباد کرنے کے لئے بغیر معاوضہ کے قطعات زمین مستحق مزارعین کو زراعت کے لئے مستقل بنیادوں پر دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس اعلان کے مطابق آپ نے بھی درخواست دے دی۔ چنانچہ ضروری کارروائی کے بعد آپ کو ایک غیر آباد علاقے میں کچھ زرعی زمین الاٹ ہو گئی۔ اب مشکل یہ تھی کہ اس قطعہ زمین کو بغیر ضروری سامان کے زراعت کے قابل کیسے بنایا جائے۔ ان کی اس مشکل کو حل کرنے کے لئے علاقہ کے احمدی دوستوں نے ابتدائی ضروری سامان حاصل کرنے میں تعاون کیا جس کی مدد سے آپ اس بے آب وگیاہ قطعۂ اراضی کو قابل کاشت بنانے کے قابل ہو گئے۔ اس طرح رازق خدا نے انتظام کر دیا اور اس طرح رشتہ داروں اور دیگر مخالفین پر یہ ثابت کر دیا کہ حق کو اختیار کرنے والا شخص باوجود اپنوں اور غیروں کی مخالفت اور ناروا سلوک کے ترقی ہی کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے نہ صرف اس کی روحانی ترقی کرنے میں مدد مہیا کرتا ہے بلکہ ذریعہ معاش بھی مہیا کر کے اس کی دنیوی ترقی کے ساماں بھی پیدا کرتا ہے۔ اس کے راستہ کی تمام رکاوٹیں ایک ایک کر کے ختم ہوتی چلی جاتی ہیں اور یہ سب کچھ قوت ایمانی اور خدا تعالیٰ پر کامل یقین سے ہوتا ہے۔

آزمائش کا نیا دور:

جب علاقہ کے لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ آپ اپنے پاؤں پر مضبوطی سے کھڑے ہوتے جا رہے ہیں اور آپ کے دینی علوم سے واقفیت اور تقویٰ کا چرچا عام ہوتا جا رہا ہے تو چند شر پسندوں نے آپ کے رشتہ داروں سے مل کر آپ پر ایک مرتبہ پھر عرصہ حیات تنگ کرنے کے لئے آپ کا مقاطعہ کر دیا۔ گاؤں اور ملحقہ علاقہ کے تمام پیشہ وروں اور دکانداروں کو سختی سے ہدایت کر دی کہ ان سے کسی قسم کا لین دین نہ کریں چنانچہ سب نے اس پر عمل کیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب پن چکی پر آٹا پسانے کے لئے مکئی یا گندم

بھجوائی جاتی تو مالک انکار کر دیتا۔ لہذا کسی اور ذریعہ مثلاً پتھر کی سل وغیرہ پر غلہ پیس کر آٹا تیار کیا جاتا اور اس طرح بسر اوقات ہوتی۔ غرض کہ یہ مقاطعہ کا وقت نہایت مشکلات اور سختی کا گذرا۔ مگر باوجود ان مشکلات کے آپ نے نہ صرف استقلال واستقامت سے کام لیا بلکہ جب بھی کسی سے ملاقات ہوتی اسے ضرور پیغام حق پہنچاتے۔ جب ان حالات سے دوچار رہتے ہوئے کچھ عرصہ بیت گیا اور آپ حرف شکایت زبان پر نہ لائے تو گاؤں اور قرب وجوار کے بعض معقول افراد نے مل کر اور دوسرے مقامی لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد مقاطعہ ختم کرنے کا فیصلہ کیا تو لین دین اور دیگر معاشرتی معاملات دوبارہ شروع ہوئے۔ لیکن باوجود اس کے بعض شرپسند آپ کے رشتہ داروں کو انہیں تنگ کرنے پر اکساتے رہتے اور تنگ کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ یہ زمانہ خاص طور پر آزمائش کا تھا کیونکہ ایک طرف تو کفر کے فتوے لگائے جاتے اور دوسری طرف آپ پر عرصہ حیات تنگ کرنے کی تاک میں اپنے اور بیگانے ہر وقت لگے رہتے۔

دینی علم میں اضافے کی لگن:

آپ کو ذاتی مطالعہ اور عالموں سے بحث وتمحیص کے ذریعہ علم میں اضافہ کرتے رہنے کا بہت شوق تھا۔ تعلیم اس دور کے مطابق مسجد کے مکتب میں حاصل کی تھی جو قرآن مجید ناظرہ پڑھنے، چند فارسی کی کتب، اردو بطور زبان اور بنیادی دینی مسائل تک محدود تھی۔ علوم متداولہ میں دسترس نہ ہونے کے برابر تھی۔ آپ دینی کتب خصوصاً سلسلہ کی کتب جہاں سے بھی میسر آتیں خرید کر مطالعہ کرتے اور دوسروں کو مطالعہ کے لئے دیتے۔ جن احباب سے علم میں اضافہ کے لئے خاص لگاؤ اور ملاقات تھی ان میں سے موضع 'سلواہ' کے مولوی عبدالحی صاحب مرحوم بھی شامل ہیں۔ مولوی موصوف مدرسہ احمدیہ قادیان میں کچھ عرصہ زیر تعلیم رہے تھے۔ یہ خلافتِ اولیٰ کا دور تھا۔ قادیان میں قیام کی وجہ سے حضرت مرزا محمود احمد صاحب سے جو بعد میں خلافت ثانیہ پر متمکن ہوئے ذاتی جان پہچان تھی۔ آپ پندرہ بیس میل سفر کر کے ان کے پاس حاضر ہوتے۔ اکثر ان سے علمی گفتگو ہوتی اور دوستانہ ماحول میں تبادلہ خیال ہوتا۔ کئی کئی روز ان کے ہاں قیام ہوتا اور پیش آمدہ مسائل پر سیر حاصل گفتگو ہوتی۔ علمی مشاورت کے علاوہ علاقے میں دینی اقدار کو عام کرنے اور جماعتی نکتہ نگاہ کو عام کرنے کی تدابیر کرتے۔ ان کے علاوہ دیگر صاحبان علم خواہ ان کا تعلق جماعت سے ہو یا نہ ہو سے رابطے کرتے تا دینی علم میں اضافہ ہوتا رہے۔

دعوت حق کا شوق:

ہر طرف آواز دینا ہے ہمارا کام آج
جس کی فطرت نیک ہے وہ آئے گا انجام کار
(براہین احمدیہ پنجم صفحہ 137)

دھوڑیاں بھاٹہ کے گاؤں میں ہمارا اکیلا ہی احمدی گھرانہ تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو والد صاحب کو ہر ملنے والے کو ظہور مہدی موعود کا پیغام دیتے دیکھا۔ اور اگر کوئی جماعت احمدیہ کا دوست کسی دوسرے علاقہ یا گاؤں سے آتا تو ہر آن احمدیت کے بارے میں ہی باتیں ہوتیں یا اسلامی تعلیمات اور ان پر صحیح رنگ میں عمل کرنے کی تجاویز کا ذکر ہوتا اور اگر کوئی غیر از جماعت ہوتا تو اسے جماعت کے بارے میں معلومات بہم پہنچاتے۔ گھر کے چھوٹے بڑے تمام افراد کو اکٹھا کر کے نماز باجماعت پڑھاتے۔ کچھ عرصہ بعد جب توفیق ہوئی تو ایک چھوٹی سی مسجد گھر کے قریب ہی تعمیر کروائی اور اس میں گھر کے تمام افراد نمازیں باجماعت ادا کرتے اور جمعہ کی نماز بھی اسی مسجد میں ہوتی۔

ہمارا خاندان مذہبی روایات کا حامل تھا۔ ہمارے تائے چچے جو احمدی نہیں تھے وہ بھی نماز روزہ کے حتی المقدور پابندی کرتے تھے۔ اپنے اپنے طریق پر عبادات واذکار میں مشغول رہتے تھے۔ روایت ہے کہ خاندان کے مورث اعلیٰ وادی کشمیر سے نامعلوم وجوہ کی بنا پر نقل مکانی کر کے اس علاقہ میں آباد ہو گئے تھے۔ خاندانی اعتبار سے ہم لوگ "میر کشمیری" ہیں اور کشمیر کے دوسرے خاندانوں کی طرح کسی کام کو ہمارے بزرگ عار نہیں سمجھتے تھے بلکہ باعزت گذر اوقات کے لئے ہر پیشہ اختیار کر لیتے۔ ہماری برادری کے کچھ دوسرے افراد بھی ارد گرد کے دیہات اور قصبوں میں آباد تھے اور عموماً آپس ہی میں شادیاں کرتے۔ غیر خاندان یا قبیلہ میں بہت کم رشتے ہوتے لیکن احمدیت یعنی حقیقی اسلام اختیار کرنے کے بعد یہ قید جاتی رہی۔

جب بھی علاقہ میں حکومت کا کارندہ یا افسر یا کوئی اور اہم آدمی آتا تو اسے گھر پر مدعو کرتے اور اس طرح تبادلۂ خیالات کا موقع پیدا کر لیتے۔ احمدی افراد کو صحیح احمدیت کے رنگ میں رنگین ہونے کی تلقین کرتے اور دوسرے مسلمانوں کو کہتے کہ آپ اسلامی تعلیمات پر عمل کریں اور جب آپ کو صحیح اسلامی تعلیمات پر گامزن ہونے کی توفیق مل جائے گی تو خود بخود احمدیہ مسلک کی بھی سمجھ آ جائے گی۔ کیونکہ

احمدیت حقیقی اسلام کا ہی دوسرا نام ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب بھی گھر پر کوئی مہمان آتا تو اس کے قیام وطعام کے بعد آپ کا مشغلہ اسے گفتگو کے ذریعہ دعوت حق دینے کے علاوہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتب میں سے کسی کتاب کا عوت الی اللہ اور آپ کے دعاوی سے متعلق کوئی حصہ پڑھ کر سنانا ہوتا تھا۔ اگر کوئی شخص اس کے لئے تیار نہ ہوتا تو اسے کہتے کہ اگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا کلام سننا گوارہ نہیں تو نہ سنیں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا کلام سننا تو پسند کریں گے اور معاً اسے احادیث نبویؐ میں سے کوئی حدیث سناتے۔ غرض دعوت الی اللہ کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ کوئی مجمع خواہ کسی قسم کا ہو اس میں حاضرین کی اجازت سے تقریر ضرور کرتے جس میں دعوتِ حق کا پیغام کسی نہ کسی رنگ میں ضرور موجود ہوتا۔

آپ دعوت الی اللہ میں ہمیشہ کوشاں رہتے کوئی مجلس کوئی مجمع ایسا نہ ہوتا جس میں حاضرین کی اجازت سے خطاب نہ کرتے اور ایسے خطاب میں حسن معاشرت، باہمی اخوت و پیار سے رہنے، بدرسوم کے ترک کرنے کی تلقین کے ساتھ ساتھ دعوت الی اللہ کا پیغام کسی نہ کسی رنگ میں ضرور ہوتا۔ چونکہ آپ اپنے علاقہ میں چند گنے چنے افراد جو تعلیم سے بہرہ ور تھے میں سے ایک تھے اس لئے شادی بیاہ اور غمی اور ماتمی مجالس میں لوگ آپ کی شمولیت کو غنیمت سمجھتے اور آپ کو دعوت دیتے کہ نصائح فرمادیں اور وہ ان نصائح کو سننے کے لئے ہمہ گوش ہوتے۔ آپ نصائح کا آغاز معاشرتی برائیوں کے ذکر سے کرتے اور ان کے ترک کرنے کی تلقین کرتے۔ اس سلسلے میں اسلامی صحیح تعلیمات کا ذکر کرتے۔ معاشرے میں انحطاط کی وجوہ بیان کرتے اور تان آ کر اس بات پر ٹوٹتی کہ کسی مصلح کے بغیر اصلاح ممکن نہیں اور وہ مصلح اور اصلاح کنندہ آچکا ہے اور اس کے ذریعہ ایک فعال جماعت قائم ہو چکی ہے آپ لوگ بھی اس میں شامل ہو کر اصلاح احوال کر سکتے ہیں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک شادی کا موقعہ تھا۔ ہم براتیوں میں شامل تھے۔ برات شام کے وقت منزل مقصود پر پہنچی۔ پروگرام کے مطابق برات نے رات لڑکی والوں کے ہاں بسر کرنی تھی۔ رات کے کھانے سے فراغت کے بعد حسب معمول تفریح کا شغل شروع ہو گیا جس میں دستور کے مطابق گانے بجانے کا پروگرام بھی تھا۔ اس پروگرام کے دوران تو آپ نے دخل نہ دیا۔ تاہم غیر شرعی پروگرام اور اس میں کی گئی حرکات کو دیکھنے اور سننے کا یارا نہ تھا اس لئے آپ کی طبیعت میں انقباض ہی رہا۔ رات گئے جب اہل خانہ کی طرف سے ترتیب دئے گئے پروگرام ختم ہوئے تو آپ نے صاحبِ خانہ کی اجازت سے ایک طویل وعظ ارشاد

فرمایا اور ان تمام لغویات کی جو پروگرام میں پیش ہوئیں تھیں ایک ایک کر کے نشاندہی کرتے ہوئے ایسے موقعوں پر پیش کرنے کے لئے صحیح اسلامی روایات کو بیان کیا اور سامعین کو ان کے اختیار کرنے کی تلقین کی اور اصلاحِ احوال کے لئے جو طریق ممکن ہو سکتے تھے بالوضاحت بیان فرمائے۔ مجلس میں شامل بزرگوں اور سنجیدہ احباب نے آپ کی بیان کردہ باتوں کو پسند کیا اور آئندہ اس پر عمل کرنے کی ضرورت پر اتفاق کیا۔

احکام سلسلہ کی پابندی:

آپ جماعت کی تعلیمات، اصولوں اور قواعد وضوابط کی سختی سے پابندی کرتے۔ مخالفین کی مخالفت خواہ کتنی بھی شدید ہو انجام کی پرواہ کئے بغیر مومنانہ جرأت سے مقابلہ کرتے۔ اپنے خاندان میں اکیلے احمدی ہونے کی وجہ سے بچوں کے رشتے طے کرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا رہا مگر اصول اور احمدیت کی تعلیم کی پابندی کی وجہ سے کوئی رشتہ خصوصاً بیٹیوں کا غیر از جماعت رشتہ داروں میں نہیں کیا۔ آپ کی نرینہ اولاد چھ بیٹوں میں سے ایک کے علاوہ باقی سب رشتے احمدی خاندانوں میں طے پائے۔ ایسے معاشرے میں جہاں خاندانوں میں ہی رشتے کرنے کا رواج ہو اور خاندان سے باہر رشتہ کرنے کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا ہو وہاں اس رواج کی خلاف ورزی کرنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے لیکن آپ نے اس مشکل کو بھی اپنی قوت ایمانی کے زور پر آسان بنا دیا۔

آپ نے اپنی ایک بیٹی کا رشتہ اپنے علاقہ سے اس وقت کے لحاظ کے مطابق بہت دور یعنی پٹھانکوٹ ضلع گورداسپور میں مربی سلسلہ مولوی محمد حسین رفیق حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وساطت سے طے کیا۔ آج کے دور میں تو شائد یہ بات عجیب معلوم نہ ہو لیکن اس زمانہ کے لحاظ سے ایک کوہستانی لڑکی کو اپنے آبائی علاقہ سے سینکڑوں میل دور اور پھر چلچلاتی دھوپ والے میدانی علاقہ میں بیاہ دینا خود لڑکی اور والدین کے لئے بڑی قربانی تھی۔ یہ قربانی سلسلہ کی تعلیمات کی روشنی میں کی گئی تھی اور شائد کہ اس جذبہ کے تحت اس پر عمل کرنا آسان ہو گیا تھا۔ یہ رشتہ غالباً 1942ء میں ہوا تھا۔ اس زمانہ میں احمدیوں کے باہمی رشتوں میں خصوصاً ہمارے علاقہ میں، وہ ربط نہیں تھا جو آج کل ہے۔ تاہم اس وقت بھی آپ اس بات کے سختی سے پابند تھے کہ احمدی لڑکی کا رشتہ احمدی گھرانے میں ہی ہونا چاہئے خواہ کتنی ہی مشکلات درپیش کیوں نہ ہوں اور اسی جذبہ ایمانی کے تحت آپ نے یہ فیصلہ کیا تھا۔

سلسلہ احمدیہ کے مرکز کی طرف سے جو بھی تحریک ہوتی اس میں باقاعدہ حصہ لیتے۔تحریک جدید کی تحریک ہوئی تو اس میں شرح صدر سے حصہ لیا اور اس مالی جہاد میں تازیست باقاعدگی سے حصہ لیتے رہے۔ وقف جائیداد کی تحریک ہوئی تو اس میں بھی حصہ لیا۔آپ موصی تھے اور اپنی زرعی جائیداد کا حصہ وصیت اپنی حین حیات میں ادا کر دیا تھا۔

آپ کے کردار کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ سچائی اور راستبازی کا دامن ہمیشہ پکڑے رہتے۔آپ کے بارے میں سارے علاقے میں مشہور تھا کہ آپ سچے ہیں اور ہمیشہ سچ بولتے ہیں اور کبھی جھوٹ کے قریب بھی نہیں جاتے۔مخالف سے مخالف بھی یہ کہتا اور تسلیم کرتا کہ "میاں صلاح محمد" جو بات کہے اس کے لئے مزید ثبوت کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ جھوٹ نہیں بولتے اور کہ وہ احمدی ہیں اور احمدی عموماً سچ بولتے ہیں۔
علاقے کے افسروں اور حاکموں پر آپ کی سچائی اور راستگوئی کا اس قدر اثر تھا کہ وہ بھی آپ کی کسی بات یا کسی امر کی تصدیق کرنے کے لئے کسی مزید ثبوت کو غیر ضروری تصور کرتے اور معاملات کو نپٹا دیتے۔

وفات:

؎ بنا کردند خوش رسمے بخاک خون غلتیدن
خدا رحمت کنند ایں عاشقانِ پاک طینت را

والد صاحب بچپن میں ہی احمدیہ تحریک اور تعلیمات سے متاثر ہوئے اور عنفوان جوانی میں ہی احمدیہ جماعت میں شمولیت اختیار کر لی۔اپنوں اور بیگانوں کی شدید مخالفت برداشت کی۔سخت ترین حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے زندگی کی دوڑ جوں توں جاری رکھی اور محض عنایت الٰہی سے کامیاب رہے۔ اپنے عقائد پر قائم رہتے ہوئے اس کانٹے دار ماحول میں اپنی اور بال بچوں کی گذر اوقات کے ذرائع پیدا کر لئے گویا ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔آپ کا مطمع نظر کام اور صرف کام تھا۔کبھی کھیتی باڑی کا کام،کبھی مویشیوں کی دیکھ بھال کا کام،کبھی گھر کی تعمیر کے سلسلہ میں بڑھئی کا کام اور پھر دیہاتی طرز کی راج گیری اور پھر وقت ملنے پر دعوتِ حق کے پیغام کے پہنچانے کا کام۔یہ تمام کام ہم نے اپنے بچپن میں انہیں اپنے ہاتھ سے کرتے دیکھا۔

میں نے اپنی صغیر سنی میں کام میں مشغول انہیں اکثر پنجابی کے صوفی شاعت میاں محمد بخش کے

پنجابی شعر کا یہ مصرع کبھی اونچی آواز میں اور کبھی گنگناتے ہوئے سنا:

ع کون بندے نوں یاد کرسی، ڈھونڈے کون قبر نوں

کم عمری اور کم فہمی کی وجہ سے اس بند کے گہرے اور تصوف میں ڈوبے ہوئے معانی تک تو رسائی ممکن نہ تھی لیکن دل ہی دل میں سوچتا اور دعا کرتا کہ اے خدا ہمارے والد کا سایہ ہم پر قائم رہے۔ساتھ ہی یہ بھی خیال آتا کہ اگر وہ ہم سے ہماری زندگی میں ہی جدا ہو گئے تو کم از کم میں ضرور دعا کرنے اور مرقد کی زیارت کرنے مقدور بھر جایا کروں گا۔قدرت کے کام نرالے ہوتے ہیں۔مستقبل میں اس کو کیا واقعات پیش آنے والے ہیں اس کا علم کسی کو نہیں ہوتا۔میری اس معصوم سوچ اور اپنے آپ سے کئے ہوئے سادہ اور معصوم وعدہ کے کچھ سال بعد برصغیر کی تقسیم عمل میں آ گئی۔اور وہ گھر اور مقام ہمیں مجبوراً چھوڑنا پڑا جہاں آپ کو مندرجہ بالا مصرع گنگناتے ہوئے سنا تھا اور جہاں اپنے آپ سے مزار کی زیارت کا عہد باندھا تھا۔
اپنی ملکیتی اراضی میں ہی آپ نے ایک قطعہ زمین مخصوص کیا جس میں ہمارے بڑے بھائی عبدالرحمان صاحب ابدی نیند سو رہے تھے۔وہ جوانی ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔بظاہر یہی نظر آ رہا تھا کہ یہی قطعہ مستقبل میں خاندانی قبرستان کے طور پر استعمال میں لایا جاتا رہے گا اور یہیں پر آپ کا مزار ہو گا لیکن ایسا ممکن نہ ہوا۔تقسیم برصغیر کے فوراً بعد خطۂ کشمیر میں آزادی کی جنگ شروع ہو گئی اور ہمارے سارے خاندان کو وہاں سے نومبر 1948ء ہجرت کرنا پڑی۔خاندان کے تمام افراد کو بے سروسامانی کے عالم میں موضع چک جمال ضلع جہلم میں مہاجرین کے لئے قائم کردہ کیمپ میں قیام پذیر ہونا پڑا۔میں ان دنوں جامعہ احمدیہ میں زیر تعلیم تھا۔جامعہ احمدیہ ان دنوں احمد نگر،نزد ربوہ میں قائم تھا۔جب مجھے اطلاع ملی کہ ہمارے خاندان کے افراد کیمپ میں قیام پذیر ہیں تو میں انہیں ملنے کے لئے کیمپ پہنچا۔وہاں لوگ عالمی جنگ کے زمانہ میں فوج کے لئے تیار کردہ بیرکوں میں بے سروسامانی کی حالت میں سر چھپائے ہوئے تھے۔ہجرت کو چند ماہ ہی گذرے تھے کہ والد صاحب کے انتقال کی اندوہناک خبر ملی یہ انتہائی روح فرسا خبر اور اس پر مستزاد یہ کہ خاندان کی کشتی کا کھیون ہار کشتی کو منجدھار کے عین بیچ میں ہچکولے کھاتی ہوئی چھوڑ کر ابدالآباد کی طرف روانہ ہو گیا۔نومبر 1948ء کو گھر بار چھوٹتا ہے اور 2 مارچ 1949ء کو یعنی صرف پانچ ماہ بعد والد صاحب اس دار فانی سے کوچ کر کے ابدالآباد میں جا بستے ہیں۔

آپ کا انتقال پر ملال چک جمال کے کیمپ میں ہوا اور وہیں قریب کے قبرستان میں تدفین عمل

میں آئی۔ دیگر مہاجرین کی لاتعداد قبروں میں ایک مٹی کا ڈھیر یہ مزار بھی بنا۔ بے سروسامانی کا عالم تھا۔ قبر کو پختہ کرنے یا کم از کم ایسی شکل دینے کا جس سے کچھ عرصہ نشان باقی رہے کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حالات ناگفتہ بہ ہونے کی وجہ سے کیمپ میں اکثر لوگ بیمار رہتے اور جس کی اجلِ مسمّی آ جاتی وہ رخصت ہو جاتا۔ ہمارے رشتہ داروں میں سے بھی بہت سے بیمار تھے خبر ملنے پر 1950ء کی موسمی تعطیلات میں بیماروں کی عیادت اور میل ملاقات کے لئے چک جمال کے کیمپ میں گیا۔ دعاء مانگنے کی غرض سے قبرستان گیا اور آپ کی قبر پر حاضری دی۔ جائزہ لینے پر اندازہ ہوا کہ یہ مٹی کی معمولی سی ڈھیری کچھ عرصہ گذرنے پر معدوم ہو جائے گی۔

شہر خاموشاں کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ یہ خیال آیا کہ اگلے سال تک تو شائد قبر کی تلاش بھی ممکن نہ رہے کیونکہ کوئی بھی تو امتیاز کرنے والی نشانی وہاں موجود نہ تھی۔ اس خیال کے ساتھ ہی بچپن میں آپ کی آواز میں بار بار پڑھتے ہوئے سنے گئے اس پنجابی شعر:

ع کون بندے نوں یاد کریسی، ڈھونڈے کون قبر نوں

کی یاد تازہ ہوگئی۔

کیمپ میں قیام پذیر بعض آپ کے دیرینہ شناساؤں سے بات کی اور باہم مشورہ سے طے پایا کہ کچھ پختہ خشت موجود ہیں اور کچھ اور خرید کر اور ایک بیگ سمنٹ خرید کر کم از کم قبر کے ڈھیر کی حد بندی کر دی جائے اور اسی سامان میں سے اینٹوں کا ہی کتبہ تیار کر کے اس پر نام کندہ کر دیا جائے۔ چنانچہ تجویز اور فیصلہ کے مطابق ایسا ہی کیا گیا۔ جب تک کیمپ میں مہاجرین قیام پذیر رہے۔ ایک آدھ مرتبہ قبر پر حاضری دی اور دعاء مغفرت کی۔ پھر مہاجرین کیمپ خالی ہوگیا۔ گردش ایام مجھے کہیں سے کہیں لے گئی اور ملکوں ملکوں گھوما کئے۔ گردش ایام بھلا کسے چین دیتی ہے۔ کبھی مغربی افریقہ، کبھی جنوبی امریکہ اور پھر مشرقی یا یوں سمجھیں کہ وسطی افریقہ۔ دیگر کنبے کے افراد بھی دنیا کے کونے کونے میں پہنچ گئے اور محولہ بالا مصرع میں بیان کردہ حقیقت کی سچائی ٹھوس شکل میں پوری ہوتی دیکھا کئے۔

1979ء میں زیمبیا وسطی افریقہ، سے واپس پاکستان پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد محولہ بالا مصرع اور اس کے بچپن میں والد صاحب کی زبانی سننے اور پھر دل ہی دل میں عہد باندھنے کا شدت سے احساس ہوا۔ تو اپریل 1983ء میں چک جمال اس قبرستان میں ایصال ثواب کے لئے دعاء کرنے کے قصد سے پہنچا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ اردگرد خاردار تار لگے ہوئے ہیں اور ایک فوجی گیٹ پر موجود ہے۔ اس نے بتایا کہ اب یہ فوجی ایریا ہے۔ قبرستان بھی اس کا حصہ ہے یہاں اب تدفین نہیں ہوسکتی۔ پہریدار سے اجازت ملنے پر اندر گئے۔ قبر کی تلاش کی تو برسوں پہلے نصب کردہ اس معمولی سے کتبہ کی نشاندہی ہوگئی۔ قبر کی حدود کی تعین کے لئے نصب شدہ اینٹیں بھی موجود تھیں لیکن قبر کسی حد تک بیٹھ چکی تھی۔ وہی مصرع شدت سے یاد آیا۔ عہد بھی یاد آیا۔ دعاء کے لئے ہاتھ اٹھے۔ بے اختیار چند آنسوں گرے اور نذرانہ عقیدت اور محبت بن کر خشک ہو گئے۔ اور یہ شعر زبان پر بے ساختہ آ گیا:

ے آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

سبزہ نو ستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!

آپ کے سب سے چھوٹے بیٹے اور ہمارے برادر خورد عبدالکریم صاحب طارق کو خدا نے قبر کو پختہ کرنے اور سنگ مرمر کا کتبہ نصب کرنے کی توفیق دی۔ وہ ڈنمارک سے 1990ء میں پاکستان آئے اور یہ سعادت حاصل کی۔ خدائے برتر ان کو جزائے خیر دے۔ یہ کتبہ کچھ سال رہے گا اور پھر خدا جانے کون کیا کروائے گا۔

والد صاحب موصی تھے ان کی وصیت کا نمبر 8718 (ستاسی صد اٹھارہ) ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ابتدائی موصیوں میں سے تھے۔ وفات ایسے حالات میں ہوئی کہ وصیت کردہ مقام یعنی قادیان اور بعد میں ربوہ میں سے کسی جگہ بھی نعش مبارک کو نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔ بعد میں سارے حالات سے نظارت بہشتی مقبرہ قادیان کو "یادگار کتبہ" قادیان کے مقبرہ میں نصب کرنے کے لئے لکھا گیا اور وہاں پر کتبہ یادگار نصب ہے۔ جس پر تحریر ہے:۔

کتبہ یادگار 601، قطعہ نمبر 4، حصہ نمبر 20،

وصیت نمبر 8718،

مکرم صلاح محمد، بھاٹہ دھوڑیاں، پونچھ۔

تدفین موضع چک جمال۔ جہلم۔

وفات 2 مارچ 1949ء۔ عمر 65 سال

اس ضمن میں ایک واقعہ کا ذکر بھی ضروری ہے کیونکہ اس سے آپ کے سلسلہ سے وابستگی اور

خاندان حضرت مسیح موعودؑ سے والہانہ محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ کو حضرت مصلح موعودؓ کی زیارت کا ہمیشہ شوق رہتا۔ چک جمال کیمپ میں ہی آپ کو کسی ذریعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت مصلح موعود 'سرائے عالمگیر' جہاں اِن دنوں فرقان فورس کا ہیڈ کوارٹر تھا تشریف لا رہے ہیں۔ اس خبر کے ملتے ہی آپ اور مولوی ثناء اللہ صاحب راجوروی حضور کی زیارت کے لئے 'سرائے عالمگیر' روانہ ہوئے۔ مگر حضور کسی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ یہ دونوں حضرات کو واپس چک جمال روانہ ہوئے۔ سفر پیدل تھا راستہ میں بخار نے آلیا۔ دونوں ہی ستانے کے لئے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اتنے میں صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب کی موٹر کار گذری۔ وہ کسی کام چک جمال جا رہے تھے۔ جب انہوں نے دو سفید ریش بزرگوں کو دیکھا تو کار روک کر ان دونوں کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ تعارف ہوا تو صاحبزادہ صاحب موصوف کے ہاتھ چوم کر کہا کہ الحمد للہ کہ 'حضرت مصلح موعود کی زیارت نہیں ہوئی تو حضور کی نشانی تو مل گئی' حضرت صاحبزادہ صاحب بھی خوش ہوئے کہ حضرت مسیح موعود کا زمانہ پانے والے دو افراد سے ملاقات ہوگئی۔ ان ہر دو کو صاحبزادہ صاحب نے ان کی جائے رہائش پر پہنچا دیا۔ اس ملاقات کے چند دن بعد قضاء الٰہی سے آپ کی وفات ہوگئی۔

تربیت اولاد:

حضرت والد صاحب مرحوم کا ذکر ہو رہا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی لاتعداد خوبیوں میں سے ایک ایسی بات کا ذکر ہو جائے جو اعمال جاریہ میں شمار ہوتی ہے۔ اور وہ اولاد کی ایسی تربیت کرنا ہے جو نافع الناس ہو، اپنے مذہب پر عامل ہو، دین کی خدمتگذار ہو اور والدین کے لئے دعا بھی کرتی رہے۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے ہمارے گاؤں میں صرف ہمارا گھر احمدی تھا۔ آپ گھر کے تمام چھوٹے بڑے افراد کو جمع کر کے نماز با جماعت پڑھاتے۔ اکثر خود امامت کے فرائض سرانجام دیتے۔ لیکن کبھی اپنے کسی بیٹے کو جو اس قابل ہوتا کہ امامت کر سکے اسے نماز پڑھانے کی ہدایت فرماتے۔ گھر کے قریب ہی ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کروا دی تھی تا کہ عبادت میں آسانی رہے۔ مسجد کی تعمیر کے ساتھ ہی گویا سارے علاقہ سے مقابلہ کی صورت پیدا ہوگئی۔ علماء ظاہر نے مزید مخالفت شروع کر دی اور عوام کو ہمارے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا کہ اب دیکھو انہوں نے احمدیت کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے ایک مرکز بنا لیا ہے۔ گھر بار اور کاروبار تو پہلے سے رواں دواں تھا۔ گھر کے قریب ہی خدا کا گھر بن جانے سے علاقہ میں ساکھ بن گئی۔ آپ

تعلیم و تربیت اور دعوت الی اللہ کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ ہمیں اکٹھا کر کے تعلیم دینے کا ذکر گذر چکا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ کلہاڑا گرنے سے میرے پاؤں پر زخم آ گیا۔ زخم اتنا گہرا اور شدید تھا کہ چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ اکثر سارا دن بستر پر لیٹے گذرتا۔ ایک دن لیٹے لیٹے کوئی کتاب دیکھ رہا تھا کہ آپ 'کشتی نوح' جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تصنیف ہے لائے اور مجھے دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ کتاب پڑھو۔ اس بات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو دینی تعلیم سے کس قدر لگاؤ اور شغف تھا اور دل کی گہرائیوں سے اس بات کے متمنی تھے کہ ان کی اولاد بھی دین کی تعلیم حاصل کرتی رہے۔ ادھر ادھر کی کتب کے مطالعہ کی بجائے دینی کتب کا مطالعہ ہو۔ اگرچہ یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے لیکن سوچنے اور سمجھنے والوں کے لئے اس میں بہت سبق پنہاں ہے۔

آپ کو ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتی کہ آپ کی اولاد ماحول سے متاثر نہ ہونے پائے۔ چونکہ قرب و جوار میں کوئی با قاعدہ جماعت قائم نہ تھی اور نہ ہی احمدیت کا پاکیزہ ماحول میسر تھا لہٰذا اس کمی کو پورا کرنے کے لئے گھر میں مذہبی کتب خصوصًا بچوں کی تربیت سے متعلق اور اسلام کے ابتدائی مسائل بہم پہنچانے والی کتب ہر وقت موجود رہتیں اور ان کتب کے مطالعہ کی حتی الامکان بچوں کو تلقین کرتے۔ فارغ اوقات میں گھر کے تمام افراد کو اکٹھا کر کے سلسلہ کی کوئی نہ کوئی کتاب پڑھ کر سناتے۔

اولاد کی تربیت کے مقصد میں آپ نے کامیابی بھی حاصل کی۔ ہم دس بہن بھائی تھے۔ ہم سب کے دلوں میں درج ذیل چیزوں کی نفرت پیدا کر دی تھی۔ حقہ یا سگریٹ نوشی، گانا بجانا اور تماشہ وغیرہ میں حصہ لینا یا خانقاہ پر چڑھاوا جو اس علاقہ میں عام رواج تھا وغیرہ تمام لغویات سے نفرت دلا دی تھی۔ گھر کے پاکیزہ ماحول اور ہر وقت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ذکر کی وجہ سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہمارا ماحول دوسروں سے بالکل الگ ہے۔ اس ماحول میں ایسا رنگ تھا جو ایک احمدی گھرانے کا طرۂ امتیاز ہونا چاہئے۔ نماز با جماعت ہوتی، گھر کے تمام چھوٹے بڑے افراد جمع ہو کر جماعت کے ساتھ نمازیں ادا کرتے۔ اس طرح سب بچوں کو نماز ادا کرنے کی ایک لگن سی ہوگئی۔

گھر کے افراد میں سے اگر کسی میں کوئی کوتاہی دیکھتے تو جمعہ کے روز اسلامی تعلیم کی روشنی میں ایسے مناسب طریق اور انداز سے جمعہ کا خطبہ ارشاد فرماتے کہ کوتاہی کرنے والا یہ محسوس کرتا کہ آج کے

خطبہ اور نصائح کا روئے سخن وہی ہے اور اس کی کوتاہی کے بارے میں اسے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اسے ترک کر دے۔

دور اندیشی، مجسمۂ صبر و راضی برضا:

موسم سرما 1942ء یا 1943ء کا واقعہ ہے کہ ہمارے سب سے بڑے بھائی عبد الرحمان مختصر علالت کے بعد عین عنفوان شباب میں ہمیں داغ مفارقت دے کر اس دارِ فانی سے دار البقاء کو سدھار گئے اور پانچ معصوم بچے اور جوان بیوہ اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ ان کی بیماری کے دوران والد ماجد نے تمام میسر ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے علاج معالجہ کو پوری تگ و دو کی۔ جب افاقہ ہوتا نظر نہ آیا تو ایک روز مجھے کہا کہ قلم دوات اور کاغذ لاؤ۔ میں اس وقت چوتھی جماعت کا طالب علم تھا۔ جب میں مطلوبہ چیزوں کے ساتھ حاضر ہوا تو فرمایا عبد الرحمان کی بیماری میں افاقہ نہیں ہو رہا حضور یعنی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی خدمت میں دعا کی درخواست لکھ کر ڈاک کے سپرد کرتے ہیں اور پھر دعائیہ درخواست کی عبارت مجھے املاء کروائی اور فرمایا کہ خط لکھنے کے ساتھ ہی مریض کو افاقہ ہونا شروع ہو جائے گا کیونکہ خدا تعالیٰ کو علم ہے کہ ہم نے اس سے شفا کے حصول کے لئے اس کے مقرر کردہ خلیفہ کو شفا کی درخواست کے لئے وسیلہ بنایا ہے۔ دراصل شفا دینے والے نے ہی دینی ہے۔ وہ علیم و خبیر ہے اور ہر جگہ موجود ہے اور جانتا ہے ہم نے کس مقصد کے لئے خلیفہ وقت سے درخواست کی ہے۔ ان کے اس استدلال سے میرے خام ذہن پر بہت اثر ہوا۔ کیونکہ ان کا یہ عارفانہ کلام خدا تعالیٰ پر کامل یقین کا اظہار تھا۔ چنانچہ خط ڈاک کے سپرد کر دیا گیا۔ لیکن ادھر تقدیر مبرم تھی نہ ٹلی اور چند روز بیمار رہنے کے بعد ان کی وفات ہو گئی۔

سردیوں کا موسم تھا اور برف نے سارے علاقہ کو ڈھانپا ہوا تھا اور اس گاؤں میں ہمارا واحد احمدی گھر تھا۔ علاقے میں دو اور گاؤں میں احمدی تھے لیکن ہمارے اور ان کے درمیاں کافی فاصلے تھے۔ ان کو اطلاع تو بھجوائی لیکن غالباً موسم کی خرابی کی وجہ سے وفات کے اگلے روز بھی دوپہر تک کوئی بھی نہ پہنچا۔ والد ماجد نے اکیلے ہی اپنی ملکیتی زمین میں جو جگہ قبرستان کے لئے مختص کی ہوئی تھی قبر کھودنی شروع کر دی۔ کیونکہ اسلامی احکامات کے مطابق جتنی جلدی ہو سکے میت کو سپرد خاک کر دینا ضروری تھا۔ ہمارے دو بھائی جو والد ماجد کا ہاتھ بٹا سکتے تھے ان میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا ایک تو فوج میں تھے اور دوسرے جو دیہاتی

مربی تھے کسی دور دراز علاقہ میں گئے ہوئے تھے۔ ہم چھوٹے تھے اور گھر پر موجود سب عورتیں بچے غم سے نڈھال تھے اور پورا ماحول غمگین تھا۔ اس انتہائی غم کی حالت میں والد ماجد کی ہی ہمت تھی کہ صبر کا دامن تھام کر مرحوم بیٹے کی میت سپرد خاک کرنے کے لئے قبر تیار کرنی شروع کر دی۔ قبر تقریباً تیار ہو چکی تھی کہ بعد دوپہر بعض غیر از جماعت رشتہ دار اور احمدی احباب پہنچے اور تجہیز و تکفین میں ہاتھ بٹایا۔

والد ماجد نے اس موقعہ پر نہ صرف خود صبر کیا اور راضی برضاء رہے بلکہ سب کو صبر کرنے کی برابر تلقین کرتے رہے۔ مرحوم کی بیوہ کو صبر کی تلقین کرتے اور فرماتے تم فکر نہ کرو ہم تمہارا ہر طرح خیال رکھیں گے اور تمہارے بچوں کی پرورش کرنا ہمارا فرض ہے اور اس فرض کو پوری ذمہ داری سے نباہیں گے۔

ہماری والدہ نے اپنے پلوٹھے بیٹے کی جوان مرگی کا بہت اثر لیا۔ وہ اکثر آنسو بہاتی اور کبھی کبھی کسی الگ تھلگ جگہ بیٹھ کر روتے روتے اپنے بیٹے کو اونچی آواز میں نام لے کر یاد کرتیں تو انہیں سختی سے منع کرتے ہوئے صبر کی تلقین کرتے اور رسول اللہ ﷺ کے اسوہ کا حوالہ دیتے۔ تعزیت کے لئے آنے والوں سے گفتگو کے دوران فرماتے خدا تعالیٰ کی یہی تقدیر تھی ہم راضی برضا ہیں۔ بعض اوقات فرماتے میرا مضبوط بازو ٹوٹ گیا ہے۔ جب مرحوم کے بچوں کا ذکر آتا تو فرماتے کہ اللہ تعالیٰ رازق بھی مالک بھی اور کارساز بھی ہے وہ خود ان کے لئے پرورش وغیرہ کے سامان پیدا کرے گا۔ جب تک زندہ ہیں اپنی ذمہ داری پوری کرتے رہیں گے۔ بیٹے کی وفات کے کچھ عرصہ بعد زرعی اراضی کا ایک حصہ مختص کر دیا اور دیگر بچوں کے گوش گذار کیا کہ یہ حصہ مرحوم عبد الرحمان کا حصہ ہے جو اب ان کے بچوں کا ہے حتیٰ کہ اس حصہ کی پیداوار انہی کے لئے مختص ہوتی۔ ایک رہائشی مکان بھی ان کو دیا۔ غالباً پوتے کی وراثت کا شرعی مسئلہ ان کے ذہن میں تھا کہ بعد میں وراثت کا مسئلہ نہ کہیں سر اٹھا لے اور ان کو وراثت سے محروم کرنے کا کسی کے دل میں خیال نہ پیدا ہو جائے اس لئے انہوں نے بیٹے کی وفات کے بعد جلدی یہ فیصلہ کر دیا۔

آپ نے اپنی رفیقہ حیات کے لئے الگ طور پر اپنی ملکیتی زرعی زمین کا ایک چھوٹا سا قطعہ مقرر کیا ہوا تھا جس کی پیداوار کو علیحدہ رکھا جاتا تھا اور یہ بھی غالباً اس تاثر کے تحت تھا کہ خدانخواستہ ان کے اس جہان سے رخصت ہونے کے بعد بچے اپنی والدہ کا خیال رکھنے میں اگر کوتاہی سے کام لیں تو اس قطعہ کی آمد ان کے کام آ سکے۔ نیز یہ کہ والد کے احترام کی وجہ سے اس مقررہ حصہ میں کوئی دخل اندازی نہ کرنے پائے۔ اور اگر کسی ایک کے دل میں یہ خیال پیدا ہو تو دوسرے اسے باز رکھنے کی کوشش کریں۔

6- والدہ ماجدہ:

اباؤاجداد کے ذکر میں والد ماجد کا ذکر آ گیا ہے۔ داستان ادھوری رہ جائے گی جبتک کہ والدہ ماجدہ کا ذکر نہ آئے گو مختصر ہی سہی۔ ہماری والدہ کا نام ''شاہ بیگم'' تھا لیکن مشہور شاہ مالی تھا اور خاندان میں اسی نام سے یاد کی جاتی تھیں۔ ان کی اپنی روایت کے مطابق ان کی والدہ یعنی ہماری نانی اماں ''ملک'' خاندان سے تھیں اور ہمارے نانا ابا کشمیری تھے۔ چھوٹی عمر میں ہی ازدواج کے بندھن میں بندھ گئیں تھیں انہیں دینی تعلیم کے حصول کا بہت شوق تھا۔ بچپن میں غالباً تعلیم حاصل کرنے کے مواقع زیادہ میسر نہ تھے۔ لہٰذا تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ مجھے یاد ہے کہ والد صاحب ہمیں ''یسرنا القرآن'' قاعدہ پڑھاتے تو وہ بھی قرآن مجید لے کر آ جاتیں اور والد صاحب سے درساً پڑھتیں۔

نماز وروزہ کی سخت پابندی کرتیں۔ بچوں کو صبح نماز کے لئے بیدار کرتیں اور اکثر پانچوں نمازوں کی بروقت ادائیگی کی نصیحت کرتیں۔ ہر وقت گھریلو کام میں مصروف رہتیں جب ذرا فرصت ملتی تو چرخا کاتنے بیٹھ جاتیں اور موسم آنے پر کھیت کے کاموں میں حصہ لیتیں۔ دیہاتی ماحول اور دیہات میں رہائش کی بنا پر مال مویشی کی دیکھ بھال بھی کرتیں۔ اگر کسی عورت کو کام سے جی چراتے دیکھتی تو کہا کرتی کہ کام کرو، کام سے صحت اچھی رہتی ہے اور اگر پھر بھی وہ دل لگا کر کام نہ کرتی تو اسے نصیحت کے رنگ میں کہتی کہ یہ فانی جسم کیڑوں مکوڑوں کی خوراک ہے اسے سنبھال سنبھال کر رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اصل تو روح ہے اس کی نجات کے لئے عبادت الٰہی اور خدمت خلق ہے۔ کام اور پھر کام سے سارے خاندان اور خلق خدا کی خدمت کرو اور انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرو اس سے خدا تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو گی اور روح کی بالیدگی بھی۔ وہ خود سستی اور کاہلی کے سخت خلاف تھیں۔

سالانہ جلسوں میں شمولیت کا شوق:

برصغیر کی تقسیم سے قبل جلسہ سالانہ قادیان میں شمولیت کے لئے بے چین رہتیں اور جب بھی موقع ملتا جلسہ میں شمولیت کے لئے پا پیادہ بعض اوقات دو دو دن کا متواتر سفر کرتیں۔ اس زمانے میں ہمارے گاؤں کے قریب سے کوئی سڑک نہیں گذرتی تھی کم از کم ایک روز کے پیدل سفر کے بعد کوئی بس یا لاری ملتی

تھی اور وہ بھی جبکہ موسم اچھا ہو۔ اس تکلیف دہ سفر کو وہ بخوشی برداشت کرتیں تا جلسہ سالانہ کی برکات سے مستفید ہو سکیں۔ جلسہ سے واپس آ کر ہمیں بتاتیں کہ امسال فلاں فلاں بزرگ نے تقریر کی اور فلاں بزرگ نے بڑی لمبی نماز پڑھائی اور خوب دعائیں ہوئیں بہت لطف آیا۔ ان بزرگوں میں سے بعض کے نام بھی بتاتیں۔ مثلاً حافظ روشن علی صاحب، مولوی شیر علی صاحب، مفتی محمد صادق صاحب کے نام لیتیں۔ پھر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے عورتوں سے خطاب کا ذکر ہوتا۔ یہ سب کچھ اس انداز سے بیان کرتیں کہ ہمیں محسوس ہوتا کہ کاش ہم بھی ان تمام بزرگوں کی زیارت کرتے اور ان کی روح پرور تقاریر سنتے۔ پھر ہم پوچھتے کہ ان سب مقررین نے کیا فرمایا تو کہتی سب کچھ تو یاد نہیں رہا لیکن خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی تعلیمات کی پابندی کرنے پر زور دیا۔ اور یہ کہ لوگوں کو بتاؤ کہ زمانے کا امام آ گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق اسے مانو اور اس کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر فلاح دارین حاصل کرو۔

سارے علاقہ میں اور خاندان میں ہمارا گھرانہ اکیلا احمدی تھا۔ اس لئے جب بچوں کی شادیوں کے معاملات آئے تو ہمارے والد اور والدہ دونوں نے غیر از جماعت خاندانوں میں رشتے طے کرنے گوارہ نہ کئے بلکہ احمدی گھرانوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اور اس تلاش میں انہیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جسے انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور دور دراز رشتے طے کرنے گوارہ کئے جس کا اس دور میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اولاد کی تربیت:

والدہ ماجدہ نے اپنی اولاد جس میں چھ لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں مقدور بھر تربیت کی جسمانی بھی اور روحانی بھی۔ پھر اولاد کی اولاد کی تربیت میں برابر اپنا کردار ادا کرتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تیسری نسل کے بعض بچے جوانی کو پہنچتے ہوئے دکھائے اور ان کو بھی نصیحت کرنے کی توفیق عطا کی۔ خدا تعالیٰ کے بے پایاں فضل سے باوجود نامساعد حالات کے انہوں نے بھرپور زندگی پائی اور 104 سال کی عمر میں 31 جولائی 1991ء میں اس دار فانی سے دار البقا کو سدھاریں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(تدفین بہشتی مقبرہ ربوہ (چناب نگر) قطعہ 17 حصہ 42 مزار 8 وصیت نمبر 8801)

والدہ نے اپنی زندگی میں اپنی اولاد کو پھلتے پھولتے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ وہ دنیا کے مختلف

ممالک میں پھیل گئے ہیں اور جہاں بھی گئے ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے اور ان کی تربیت کے نتیجہ میں احمدیت
یعنی حقیقی اسلام کی تعلیمات پر کاربند ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک بیٹے، تین پوتے، ایک نواسے اور ایک
پڑپوتے کو مربیان سلسلہ کے طور پر خدمت دین میں مصروف دیکھا اور انہیں اپنی دعاؤں سے نوازتے ہوئے
اس دار فانی سے دار البقا کو کوچ کیا۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کے بعض پوتے اور پوتیاں طبی تعلیم کے زیور
سے آراستہ ہو کر دکھی اور بیمار مخلوق کی خدمت میں مصروف ہیں۔ اپنی نسل کو دین و دنیا میں ترقی پذیر دیکھ کر ان کو
بڑھاپے میں مسرت ہوتی تھی کہ یہ سب کچھ خدا تعالیٰ کے فضل اور ان کی صحیح سمت تربیت کا ثمر ہے۔ خدا تعالیٰ
انہیں دار البقاء میں بھی مسرت نصیب کرے اور کروٹ کروٹ نعماء جنت سے نوازے۔ آمین

اے خدا بر تربت او ابر رحمت ہا ببار
داخلش کن از کمال فضل در بیت النعیم

ماہنامہ ''مصباح'' اپریل 1992ء میں شائع شدہ مضمون

نوٹ: والدہ ماجدہ کا انتقال 31 جولائی 1991ء کو ہوا۔ یہ مضمون ان کے
انتقال سے چند ماہ قبل کا لکھا ہوا ہے جو ان کے انتقال کے چند ماہ بعد شائع ہوا۔

ہماری والدہ شاہ بیگم صاحبہ:

دسمبر 1939ء کی بات ہے جماعت احمدیہ کے قدرت ثانیہ جوبلی جلسہ کی تیاریاں ہیں۔ دور و
نزدیک کے علاقوں کے احمدی جلسہ میں شرکت کی تیاریوں میں مصروف ہیں علاقہ پونچھ (کشمیر) کے ایک
گاؤں دھوڑیاں میں کم و بیش چھ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک گھر ہے۔ دس بارہ افراد پر مشتمل یہ گھرانہ احمدیت
کے نور سے منور ہو چکا ہے۔ ہم تین بہن بھائی کم عمر ہیں۔ ہماری والدہ کا اصرار ہے کہ انہوں نے اس اہم
جلسہ میں شرکت کرنے قادیان جانا ہے۔ بچے تو ساتھ جا نہیں سکتے اس لئے والدین میں سے والد کے متعلق
قرار پاتا ہے کہ وہ بچوں کے پاس رہیں۔ مشاورت ہوتی ہے اور بالآخر والدہ کو جوبلی کے جلسہ میں شمولیت
کی اجازت مل جاتی ہے اور وہ اور ساتھی خواتین و حضرات کم و بیش دو دن کا پیدل سفر طے کرتے ہیں تب جا
کر انہیں بس کی سواری دستیاب ہوتی ہے اور پھر ریل گاڑی انہیں قادیان پہنچاتی ہے۔ گھر والد صاحب کی

نگرانی میں ہے۔ چھوٹے بڑے بچے ان کی نگرانی میں ہیں۔ سب سے چھوٹے بچے کی عمر بمشکل دو اڑھائی
سال ہے والد کی محبت بچوں کے لئے دہرا کردار ادا کرتی ہے۔ چھوٹے بچے کو بہلانے کی خاطر ٹافی وغیرہ قسم
کی چیزیں دیتے ہیں۔ اور مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر خیال آتا ہے کہ والدین کتنی بڑی نعمت ہیں۔ اور مَیں سوچتا
ہوں کہ یہ جلسہ کیا ہے آخر اس میں کونسی اتنی کشش ہے کہ والدہ ہمیں چھوڑ کر اس میں شمولیت کے لئے چلی گئی
ہیں۔ اس وقت میری عمر بمشکل آٹھ سال ہوگی اور کسی جلسہ کے بارے میں میری یہ سوچ طبعی ہی تھی۔

ہماری والدہ شاہ بیگم صاحبہ کم و بیش ایک ماہ بعد واپس آتی ہیں۔ گھر کی رونقیں لوٹ آتی ہیں۔ جلسے
سے لائے ہوئے تبرک تقسیم ہوتے ہیں۔ خصوصاً سیدنا حضرت اقدس بانی سلسلہ احمدیہ کے لنگر کی روٹی، ہم
بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ والدہ جلسہ پر سنی گئیں تقاریر کی روئیداد سناتی ہیں۔ بزرگ ہستیوں کی زیارت،
مقدس خواتین سے ملاقاتوں میں ان کی قیمتی نصائح کا ذکر ہم بڑے اشتیاق سے سنتے ہیں۔ دل میں بار بار خیال
آتا ہے کہ کبھی ہم بھی اس قابل ہوں گے کہ ان پاک ہستیوں اور مقدس مقامات کی زیارت کر سکیں۔ بچپن کی
معصوم تمنائیں کتنی حسین ہوتی ہیں اور ان کی یادیں ان سے بھی حسین۔ کبھی یہ معصوم خواہشیں پوری ہو جاتی
ہیں۔ وقت گذرتا رہا، حالات نے کروٹ بدلی۔ برصغیر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ہم جماعت کے نئے مرکز
ربوہ میں آ گئے اور یہاں کے ہی ہو رہے۔ اور ان مقدس ہستیوں میں سے بعض کی زیارت بھی نصیب ہوئی۔

والدہ ماجدہ جنہوں نے جوبلی کے جلسہ میں باصرار شمولیت کی تھی اب عمر کے اس حصہ میں سے
گذر رہی تھیں جہاں یادداشتیں دھندلا جاتی ہیں۔ چلنا پھرنا دشوار ہو جاتا ہے، قوت سماعت اور قوت باصرہ
متاثر ہو جاتی ہے۔ گذشتہ دنوں دار الفتوح جہاں حال ہی میں وہ قیام پذیر ہوئی ہیں، ملنے گیا۔ صحن میں
چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھیں مسنون آداب بجا لانے کے بعد ساتھ بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پوچھنے لگیں کون
ہے۔ مَیں نے آزمائش کے طور پر کہا۔ ''بھلا پہچانئے تو'' کہنے لگیں ''غلام احمد'' جواب میں مَیں نے تصدیق
کی۔ کہنے لگیں۔ ''پتر ہن کجھ نظر نہیں آندا۔ یعنی بیٹے اب کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر کہنے لگیں یہ علاقہ اچھا ہے۔
میرے بیٹے نے مجھے پوچھ کر یہاں مکان بنایا ہے۔ اینٹ پر مَیں نے ہی دعا کی تھی۔ پھر سب سے چھوٹے
بیٹے کے بارے میں پوچھا جو اس وقت ان کے بقول تقریباً 53 سال کا ہے کہ وہ نہیں آیا۔ چونکہ اونچا سنتی
ہیں اس لئے مَیں بھی بلند آواز میں جواب دیتا رہا۔

پھر ہم خاموش ہو گئے اور مَیں ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔ خیالات کی اڑان مجھے بہت دور پیچھے کی

طرف لے گئی۔ حساب کی بھول بھلیاں تھیں اور میں گم تھا۔ دراصل مَیں والدہ ماجدہ کی عمر کا اندازہ لگانے میں محو تھا۔ پرانے وقتوں میں نہ ٹاؤن کمیٹیاں ہوتی تھیں اور نہ یونین کونسلیں۔ پیدائش کے وقت عمر کے اندراج کا رواج نہ تھا۔ کسی اہم واقعہ سے سن پیدائش شمار کر کے عمر کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔ مَیں بھی واقعات کی کڑیاں ملانے لگا۔ ہر زاویہ سے اندازہ لگایا۔ پہلی اور آخری اولاد کی عمروں کو مدنظر رکھا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہماری والدہ کی عمر سو سال کے لگ بھگ ہوگی۔ بعض زاویوں سے تو اس سے بھی زیادہ کا اندازہ ہے۔ ہم عصر خواتین و حضرات تو یقینی طور پر سو سال سے زیادہ عمر بتلاتے تھے۔

پھر ایک دوسرے حساب کا جائزہ لیا تو لخت لخت اکٹھا کرنے سے تصویر کچھ یوں بنی کہ آپ کی نسل میں سے اس وقت چوتھی پشت کے نونہالوں کی تعداد کم از کم سولہ ہے اور پھر اس خاکے میں رنگ بھرنے سے تصویر کچھ یوں سامنے آئی:۔

1۔ پہلی پشت	
چھ بیٹے اللہ تعالیٰ کے فضل سے جو بقید حیات ہیں	5
بیٹیاں اللہ تعالیٰ کے فضل سے جو بقید حیات ہیں	4
2۔ دوسری پشت:۔	
پوتے اللہ تعالیٰ کے فضل سے بقید حیات ہیں	23
پوتیاں اللہ تعالیٰ کے فضل سے بقید حیات ہیں	18
نواسے اللہ تعالیٰ کے فضل سے بقید حیات ہیں	26
نواسیاں اللہ تعالیٰ کے فضل سے بقید حیات ہیں	13
3۔ تیسری پشت:۔	
پڑپوتے اور پرپوتیاں اللہ تعالیٰ کے فضل سے بقید حیات ہیں	52
پڑنواسے اور پرنواسیاں اللہ تعالیٰ کے فضل سے بقید حیات ہیں	72
4۔ چوتھی پشت کے بچوں کی تعداد جن کا مجھے علم ہوسکا ہے	16
میزان	218

''جن باتوں کا مجھے علم ہوسکا ہے'' لکھنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آپ کی اگلی دو پشتوں کے نونہال پاک و ہند کے علاوہ یورپ کے مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان سب کے ''بڑی

اماں'' کے ساتھ حسبِ توفیق و حالات روابط ہیں لیکن پشتوں کے بعد اور گونہ گوں مصروفیات کی وجہ سے دوری ایک قدرتی امر ہے۔

تحدیث نعمت کے طور پر یہ بھی ذکر کرتا چلوں کہ آپ کا ایک بیٹا، تین پوتے، ایک نواسہ اور ایک پڑپوتا خدا کے فضل سے واقفینِ زندگی ہیں۔

شجرہ نصب:
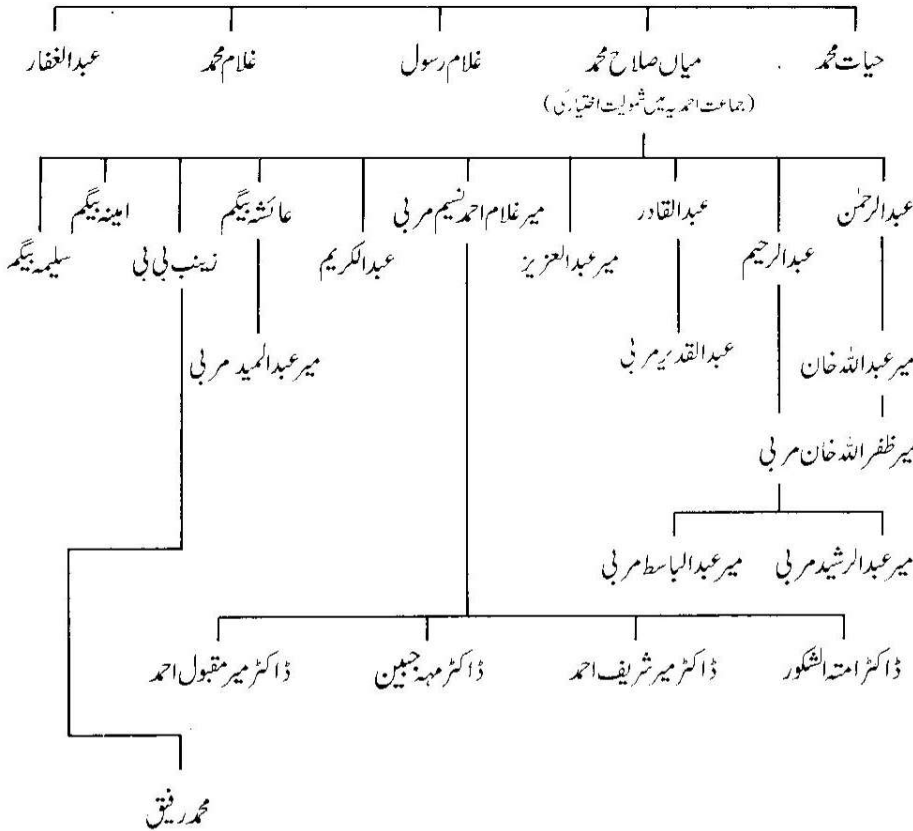
نوٹ: میاں صلاح محمد کے ابناء و بنات کثیر الاولاد ہیں۔ یہاں صرف ان کے نام دئے گئے ہیں جو مربی ہیں یا ڈاکٹر ہیں اور خدمت خلق کا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔

باب دوم

سرگذشت من

سرگذشت من چو پرسی
بشنو از من سرگذشت

پیدائش:

والدہ ماجدہ کے بیان کے مطابق میری ولادت غالباً 1929ء کے موسم گرما میں بمقام دھوڑیاں بھانہ تحصیل مہنڈر، علاقہ پونچھ، کشمیر میں ہوئی۔ مذکورہ گاؤں میں ولادت واموات کی رجسٹریشن کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے یادداشت اور زبانی روایات پر ہی انحصار ہوتا۔ تاہم سکول کے ریکارڈ میں میری تاریخ پیدائش 15 اگست 1931ء درج تھی۔ اس لئے بعد کے ریکارڈ میں اسی کو اختیار کرلیا گیا۔ اور غالباً یہی صحیح ہے کیونکہ سکول میں والدصاحب نے تاریخ پیدائش درج کرائی ہوگی۔ چونکہ وہ تعلیم یافتہ تھے اس لئے بہت ممکن ہے کہ انہوں نے یادداشت پر انحصار کرنے کی بجائے تاریخ پیدائش لکھی ہوئی ہو۔ ایک واقعہ بھی درج کیا جاتا ہے جس سے تصدیق ہوتی ہے۔ والدہ کا بیان بھی اس کی تائید کرتا ہے۔

والدہ ماجدہ میری پیدائش کا سال اور سن بتاتے ہوئے یہ بھی ذکر کیا کرتیں تھیں کہ وہ بدامنی کا سال تھا۔ عوام حکومت وقت کے خلاف جلوس نکالتے تھے اور پولیس انہیں حراست میں لیتی تھی۔ خصوصاً اس سال گرمیوں کے موسم میں لوگوں کے احتجاج میں شدت آ گئی تھی اور کہ تمہاری پیدائش بھی گرمی کے موسم میں ہوئی تھی۔ اس بدامنی اور بے چینی کی وجہ یہ تھی کہ 13 جولائی 1931ء کو سرینگر جیل میں عبدالقدیر نامی شخص پر مقدمہ بغاوت کے سلسلہ میں سماعت کے موقعہ پر نماز ظہر کے لئے ایک نوجوان کو اذان دیتے ہوئے ڈوگرا پولیس نے شہید کر دیا۔ دوسرا شخص آذان دینے آگے بڑھا تو اسے بھی گولی ماردی گئی۔ اس

طرح یکے بعد دیگرے 22 افراد شہید کر دئے گئے۔ یہ سب افراد سرینگر جیل کے باہر شہید ہوئے۔ اس واقعہ پر حالات جو پہلے ہی کشیدہ تھے اور بھی خراب ہوگئے اور جلسے جلوس نکلنے شروع ہو گئے تھے۔ یہ واقعہ اتنا دل گداز تھا کہ ان 22 شہداء کی یاد میں کشمیری ہر سال 13 جولائی ''یوم شہداء کشمیر'' مناتے ہیں۔ اس واقعہ سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ میری پیدائش 15 اگست 1931ء کی درست ہے۔

بچپن میں ہمارے والدصاحب ہم بہن بھائیوں کو صبح قاعدہ یسرنا القرآن پڑھایا کرتے اور جو ہم میں سے قاعدہ ختم کر چکے ہوتے انہیں قرآن مجید پڑھاتے۔ سرکاری سکول چونکہ ہماری رہائشگاہ سے کافی فاصلہ پر تھا اور چھوٹی عمر کے بچوں کے لئے پیدل سکول جانا مشکل تھا اور سواری کے ذرائع میں سے کوئی ذریعہ موجود نہ تھا اس لئے ساتھ ساتھ گھر پر ہی ابتدائی اردو بھی پڑھاتے اور حتی المقدور لکھنے کی مشق کراتے اور ابتدائی گنتی سکھاتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تختی پر لکھنے کی مشق کرتے ہوئے مَیں نے کچھ نقل کیا اور والدصاحب کو دکھانے سے قبل عبارت کے نیچے نام ''احمد'' لکھا کیونکہ گھر کے افراد مجھے اسی نام سے پکارا کرتے تھے کبھی کبھی 'احمد نور' بھی کہتے لیکن میں نے نقل شدہ عبارت کے نیچے صرف 'احمد' اور نام کے نیچے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ مجھے ہندسے لکھنے بھی آتے ہیں 94ب بھی لکھ دیا۔ اردو میں لکھا گیا 94 کا ہندسہ 1996 بکرمی یا وکرمی کو ظاہر کرتا تھا جو اس زمانہ میں ریاست جموں وکشمیر میں عیسوی سن کے ساتھ ساتھ رائج تھا بلکہ روزمرہ کی تحریروں میں یہی سن لکھنے کا عام رواج تھا۔ تختی پر منقش یہ کارکردگی جب والدصاحب کو دکھائی تو انہوں نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہ تمہارا نام 'غلام احمد' ہے اور تختی پر جہاں احمد لکھا ہوا تھا اس سے پہلے لفظ 'غلام' لکھ دیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ اپنا نام غلام احمد لکھا کرو۔

سن عیسوی اور سن بکرمی یا وکرمی جو ہندوستان میں رائج تھا اور جو غالباً مذہبی تہواروں کے لئے استعمال ہوتا ہے میں 56 سال کا فرق ہے۔ گویا جو میں نے اردو رسم الخط میں 94 لکھا وہ 1996ب تھا اور بکرمی سن اور عیسوی سن میں 56 سال کے فرق کی وجہ سے وہ 1940ء تھا۔ میری ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ مذہبی گھرانا تھا اس لئے قرآن مجید پڑھنا تو ہر فرد کے لئے لازمی تھا اور قرآن مجید شروع کرنے سے قبل قاعدہ یسرنا القرآن پڑھایا جاتا تھا۔ اس قاعیدہ کے پڑھنے سے دہرا فائدہ یہ ہوتا کہ اردو کا قاعدہ پڑھنے میں آسانی ہوجاتی اور صرف چھ حرف اردو پڑھنے کے لئے مزید سیکھنے پڑتے۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے اردو قاعدہ کو باقاعدہ استاد سے پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ گھر پر ہی لکھنا پڑھنا اور ابتدائی حساب سیکھا۔ جب

سکول پیدل چل کر جانے کے قابل ہوا اور ساتھ بھی میسر آئے تو سکول پہنچنے پر سکول ماسٹر نے امتحان لیا اور تیسری جماعت میں داخل کر لیا۔

ابتدائی تعلیم:

تعلیم کا آغاز اپنے گھر میں ہی ہوا اور ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے والد ماجد ہم بہن بھائیوں کو جو اس وقت ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے قابل تھے صبح کی نماز کی ادائیگی کے بعد قاعدہ ''یسرنا القرآن'' پڑھانے کے لئے بٹھا لیتے۔ ہم تین اور بعض اوقات چار بہن بھائی اکٹھے ہی ان سے سبق لیتے۔ اگلے روز جب نیا سبق شروع کرنے سے قبل گذشتہ روز کا سبق سنا جاتا تو میں عموماً ٹھیک سنا دیتا لیکن دوسرے دونوں ایک بھائی اور ایک بہن جو عمر میں مجھ سے بڑے تھے کبھی والد ماجد کے خوف سے اور کبھی غالباً سبق یاد نہ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات سبق پوری طرح نہ سنا سکتے۔ والد بارعب شخصیت کے مالک تھے ان سے خوف لگتا اور غالباً اسی لئے میں توجہ سے سبق پڑھتا اور یاد بھی کرتا۔ سبق سننے کے بعد وہ بڑی شفقت سے اگلا سبق پڑھاتے۔ ''یسرنا القرآن'' پڑھنے کے بعد جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اردو قاعدہ پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ صرف ان الفاظ کا تعارف کرایا گیا جو عربی کے حروف تہجی میں نہیں۔ قرآن مجید، اردو کی پہلی کتاب اور دوسری کتاب، ابتدائی حساب اور اردو لکھنا گھر پر ہی سیکھا۔ سکول جو ہمارے گھر سے کافی فاصلے پر تھا داخلہ لینے کے لئے گیا۔ سکول کی انتظامیہ نے ٹیسٹ لیا اور تیسری جماعت میں داخل کر لیا۔

گورنمنٹ پرائمری سکول بمقام ناڑموڑیاں ہمارے گھر سے قریباً دو سوا دو میل کے فاصلہ پر تھا۔ قریباً دو تہائی راستہ جنگل میں سے گذرتا تھا۔ جس میں چیڑ کے اونچے اونچے درخت اور دیگر قسما قسم کے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ ہم دو اور کبھی تین طالب علم اکٹھے مل کر سکول جاتے اور کبھی کبھی اکیلے بھی جانا پڑتا۔ اکیلے میں اس جنگل سے گذرتے ہوئے کبھی خوف بھی آتا تاہم سکول تک رسائی اس جنگل کے راستہ سے گذر کر ہی ہوتی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سکول میں داخل ہونے کے بعد سکول کا کام کرتے ہوئے تختی پر میں 1996 بکرمی لکھا کرتا تھا۔ اس اعتبار سے سکول میں داخلہ قریباً اکتوبر 1940ء میں ہوا۔ اس سکول میں

پڑھائی کم و بیش تین سال جاری رہی۔ جماعت چہارم کے امتحان میں کلاس میں اول پوزیشن حاصل کرنے پر بہت سے انعامات اور مبارک باد کے پیغامات موصول ہوئے۔ ناسمجھی کی عمر تھی دل خوشی سے پھولے نہ ماتا۔ سکول میں اول آنے سے جہاں عزت افزائی ہوئی اور دوست واحباب خوش ہوتے وہاں حاسد بھی پیدا ہو گئے اور آنے والے سال میں مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے فضل شامل حال رہا اور پرائمری کی تعلیم باوجود مخالف ماحول کے باحسن طریق تکمیل پذیر ہوئی۔

سکول میں پیش آمدہ دو واقعات:

سکول کے ان ایام میں پیش آنے والے دو واقعات یاد ہیں جنہوں نے طبیعت پر گہرا اور دیرپا اثر چھوڑا۔ ان میں سے پہلا واقعہ یہ ہے کہ درجہ چہارم میں اول قرار پانے کے کچھ عرصہ بعد صبح کے وقت جب سکول پہنچا تو دیکھا کہ مجھ سے پہلے چند طلبہ سکول میں پہنچے ہوئے تھے اور ان میں ایک ہمارے گاؤں کے نمبردار کا لڑکا بھی تھا لیکن ابھی تک استاد تشریف نہیں لائے تھے۔ ان سب طلبہ نے مل کر نمبردار کے لڑکے کی قیادت میں مجھے آتے ہوئے دیکھتے ہی کورس (Chorus) میں بلند آواز سے گانا شروع کر دیا:

ے مرزا تمہارا ہوتا گر سچا نبی......
تو ٹٹی میں گر کر نہ مرتا کبھی

میں پورے سکول میں اکیلا احمدی طالبعلم تھا۔ ہمارے گاؤں بلکہ اردگرد کے کئی گاؤں پر مشتمل علاقہ میں ہمارا اکیلا ایک ہی گھرانہ احمدی تھا۔ جب طلباء نے گروپ کی صورت میں اوپر درج گندگی سے بھرپور جھوٹ پر مبنی بند بلند آواز سے گانا شروع کیا تو میرا دل چھلنی ہو گیا اور میں زاروقطار رونے لگ پڑا۔ اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ ایک طرف اکیلی جان اور دوسری طرف سکول کے شرارتی اور بزعم خود بااثر لوگ کے نونہالوں کا بھرپور گروپ۔ یہ ڈرامہ جاری تھا کہ استاد محترم تشریف لے آئے۔ نہایت شریف النفس اور باکردار آدمی تھے۔ انہوں نے آتے ہی حالات کا جائزہ لیا اور مجھ سے دریافت کیا کہ کیوں آزردہ ہو۔ میں نے سارا قصہ بیان کیا اور کہا کہ یہ طلبہ نہایت گندی زبان ہمارے امام کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ استاد محترم نے ان تمام طلبہ کو طلب کیا اور یہ ثابت ہونے پر کہ انہوں نے واقعۃً یہ حرکت کی ہے اور سخت دل آزار زبان استعمال کی ہے۔ پہلے تو انہیں سرزنش کی اور کہا کہ یہ حکومت کا ادارہ ہے اور ایک پبلک سکول ہے۔ یہاں

ہر مذہب وملت اور ہر فرقہ کے لوگوں کے بچے بلا امتیاز تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور یہ کہ کر رہے ہیں۔ بعد میں ان طلبہ کو جنہوں نے اس ناپسندیدہ فعل میں نمایاں کردار ادا کیا تھا مروجہ طریق کے مطابق مناسب سزا بھی دی۔ اور آئندہ ایسی حرکت نہ کرنے کے وعدہ پر انہیں کلاسوں میں بیٹھنے کی اجازت دی۔

دوسرا واقعہ:

ہمارے سکول کی عمارت کے قریب ہی ایک معزز شخص ''عبداللہ خان'' رہتے تھے۔ وہ ذیلدار تھے۔ بڑے دبنگ قسم کے آدمی تھے۔ ایک مرتبہ وہ بیمار ہو گئے۔ بہت علاج کروائے لیکن بیماری تھی کہ جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ علاقہ کے ہر دور و نزدیک کے حکیموں اور ڈاکٹروں کے پاس گئے۔ علاج کے سلسلہ میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہوئی۔ دیکھنے میں بظاہر توانا ہی نظر آتے لیکن بیماری یا بیماری کا وہم ہر وقت ان پر سوار رہتا اور رفتہ رفتہ بیماری یا بیماری کے وہم نے ان پر قرب موت کا خوف طاری کر دیا۔ ہمارے سکول میں جبکہ سکول کی پڑھائی جاری ہوتی وقت بے وقت چلے آتے۔ ان کے ہمراہ ان کے پیر کا بیٹا بھی ہوتا جس پر وہ بہت اعتماد کرتے۔ چونکہ بیماری سے بہت تنگ آئے ہوئے تھے اس لئے اکثر اپنی بیماری اور علاج کا ذکر چھیڑ دیتے۔ سکول کے استاد بھی احتراماً ان کے پاس چلے جاتے۔ طلبہ کو تو تفریح کا موقعہ خدا دے وہ بھی ان کے پاس جمع ہو جاتے۔ ایک مرتبہ چاشت کے وقت سکول میں تشریف لے آئے حسب معمول بیماری اور علاج معالجہ کی داستان سنائی پیرزادہ ہمراہ تھے انہیں فرمائش کی کہ 'بہادر شاہ ظفر' کی غزل سناؤ۔ اس نے غزل کچھ ایسے سوز میں ڈوبے ہوئے انداز میں سنائی کہ ہمارے بچپن کے ناپختہ ذہنوں پر بھی زندگی کی ناپائیداری اور بے ثباتی کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ اکثر کی آنکھیں پرنم ہو گئیں اور اس غزل کے یہ دو شعر از بر ہو گئے۔

لگتا نہیں جی مرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں
عمرِ دراز مانگ کر لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

اس ابتدائی دور طالب علمی کا ایک اور واقعہ بھی سبق آموز بنا اور اب تک دل پر نقش ہے۔ سکول آنے جانے کے دو راستے تھے۔ ایک نزدیک کا اور دوسرا ذرا دور کا۔ نزدیک والے راستے سے ہی اکثر آنا

جانا ہوتا لیکن اگر کوئی کام ہوتا تو وہ راستہ اختیار کیا جاتا جو ذرا زیادہ فاصلے والا تھا تا کام سرانجام دیتے ہوئے گھر پہنچا جائے۔ اس راستہ میں ایک درزی کا گھر تھا جو اکثر ہمارے خاندان کے افراد کے کپڑے سیا کرتا تھا۔ ایک روز مجھے اپنے گھر سے سکول جاتے وقت کہا گیا کہ درزی کے گھر سے سلے ہوئے کپڑے واپسی پر لیتے آنا۔ اس درزی نے گھر کا ایک کمرہ اس کام کے لئے مختص کیا ہوا تھا گویا وہ اس کی دوکان تھی۔ [illegible] کا [illegible]م تھا۔ قریباً تین بجے سہ پہر اس کے گھر پہنچا۔ وہ ایک اور ساتھی کے ساتھ مصروف عمل تھا۔ ساتھ ساتھ گفتگو بھی ہو رہی تھی۔ دوران گفتگو دفعۃً اس نے پُرسوز آواز میں شعر پڑھا:

جاگنا ہے جاگ لے افلاک کے سایہ تلے
حشر تک سویا رہے گا خاک کے سایہ تلے

اور اس موزوں کلام کو کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے اس نے بار بار پڑھا اور کئی بار دہرایا۔ اس کے اس طرح اس شعر پڑھنے پر کچھ ایسا ماحول پیدا ہوا جو اثر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس اثر پذیر گفتگو اور خاص طور پر شعر سے متاثر ہو کر ہم بھی شریک مجلس ہو گئے۔ کچھ دیر بعد گفتگو نے مزاح کا رنگ اختیار کر لیا۔ اتفاق سے اس روز رمضان کے مبارک ماہ کا پہلا روزہ تھا۔ رمضان اور روزوں کی بات چل نکلی تو وہی درزی کہنے لگا ''روزے بھی ختم ہوئے رہ گئے انتیس''۔ اگرچہ ابھی تک ایک روزہ بھی پورا نہیں ہوا تھا لیکن اس نے بات کچھ اس انداز میں کہی کہ ایسے محسوس ہوا کہ گویا واقعی ماہ رمضان گذر چکا ہے اور روزے بھی گذر چکے ہیں اور باقی صرف انتیس رہ گئے ہیں۔ حالانکہ ابھی اس ماہ مبارک کا ایک روزہ بھی ہم پورا نہ کر پائے تھے کیونکہ ابھی تک پہلے روزے میں بھی دن کا کچھ حصہ باقی تھا۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ گھر پر ہی ہمیں مذہبی اور دینی ماحول ملا۔ جب اردو پڑھنا آیا تو گھر میں موجود کتب پڑھنے کا شوق ایک لازمی امر تھا۔ گھر میں زیادہ تر کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تصنیف کردہ تھیں۔ گو ان کتب میں بیان کردہ مسائل اور استعمال کردہ اصطلاحات کی سمجھ تو نہ آتی تھی لیکن پڑھنا شروع کر دیں۔ سب سے پہلے جو کتاب پڑھی وہ ''کشتی نوح'' تھی اور ''درثمین'' کے شعروں میں سے کوئی آسان نظم پڑھ لیتے۔ والد صاحب برابر تلقین کرتے کہ یہ کتابیں پڑھو۔ وہ ہر دوسرے سال قادیان جلسہ سالانہ پر جاتے اور واپسی پر جو بھی گذشتہ دو سالوں میں سلسلہ کی طرف سے نئی کتب چھپی ہوئی ملتیں لے آتے اور آتے ہی ہمیں دیتے کہ ان میں سے جو پڑھ سکتے ہو پڑھو۔

2- قادیان کی زیارت:

ع اے قادیاں دار الاماں اونچا رہے تیرا نشاں

پرائمری تعلیم جس کے پانچ درجے تھے کی تکمیل کے بعد قریباً ایک سال کا عرصہ یہ سوچنے اور فیصلہ کرنے میں گذر گیا کہ مزید تعلیم کہاں اور کس سکول میں حاصل کی جائے کیونکہ سارے علاقہ میں کوئی مڈل یا ہائی سکول ایسا نہیں تھا جس میں کہ گھر پر قیام کرتے ہوئے تعلیم جاری رکھی جا سکے۔ قریب ترین احمدیہ مڈل سکول قصبہ چارکوٹ میں تھا جو قریباً پانچ چھ میل ہمارے گاؤں سے دور تھا اور اس میں بھی طلبہ کی رہائش یعنی بورڈنگ کی سہولت موجود نہ تھی۔ ان مشکلات کے پیش نظر ایک سوچ یہ بھی تھی کہ مزید تعلیم کے حصول کے بارے میں سوچنا ترک کر دیا جائے۔ اسی سوچ و بچار میں تھے کہ جلسہ سالانہ قادیان کا موسم آ گیا۔ برادرِ کلاں مولوی عبدالرحیم صاحب جنہیں گھر کے تمام چھوٹے بڑے افراد ''مولوی صاحب'' کہتے تھے جلسہ سالانہ قادیان میں شمولیت کرنے کے لئے تیار ہوئے۔ ان کی ہمراہی کا قرعہ میرے نام نکلا۔ تین دن پیدل سفر کرنا تھا۔ دو دن تو بامر مجبوری کہ اس علاقہ میں نہ سڑک تھی اور سڑک نہ ہونے کی وجہ سے پبلک ٹرانسپورٹ کا سوال ہی نہ تھا اور پرائیویٹ سواری یعنی گھوڑے وغیرہ کی سواری کا بھی کوئی انتظام نہ تھا اور مزید ایک روز کا پیادہ پا سفر غالباً 'جتنی چادر اتنے پاؤں پھیلانے' کے فلسفہ کا مرہون منت تھا۔

اپنے گاؤں دھوڑیاں بھاٹہ سے روانہ ہو کر رات قصبہ رہتال جو شہر راجوری کے نواح میں واقعہ ہے ایک احمدی دوست کے گھر میں بسر کی۔ وہاں سے علی الصبح روانہ ہو کر نوشہرہ پہنچے اور رات وہاں بسر کی۔ وہاں سے پبلک ٹرانسپورٹ کی بس جو پونچھ سے جموں جایا کرتی تھیں مل سکتی تھی لیکن اوپر بیان کردہ وجہ کی بنا پر مسافر بس پر سوار نہ ہوئے۔ تیسرے روز قصبہ بھمبر پہنچے اور وہاں سے گجرات جانے والی مسافر بس پر سوار ہو گئے اور پھر اسی رات گجرات سے جب ریل گاڑی پر سوار ہو کر قادیان کے لئے روانہ ہوئے۔ گاڑی جب قادیاں کے قریب پہنچی تو برادرم مولوی عبدالرحیم صاحب نے دور سے ہی منارۃ المسیح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اب ہم قادیان کی مبارک بستی کے قریب پہنچ چکے ہیں اور اگلا ریلوے اسٹیشن قادیان ہی ہے۔ ہماری خوابوں کی دنیا حقیقت کا رنگ دھار چکی تھی۔ بچپن سے ہی قادیان، قادیان کی روحانی مجالس، وہاں کی روحانی کیفیت گھر گھر تسبیح وتحمید اور ذکر واذکار کے بارے بہت کچھ سنتے آئے تھے اور بچپن سے ہی ان روح

پرور مجالس اور مقاماتِ مقدسہ کو دیکھنے کی خواہش دل میں جاگزیں ہو چکی تھی اور اب اس دیرینہ تمنا کے پورے ہونے میں چند لمحات ہی باقی تھے اور بے انتہا مسرت ہو رہی تھی۔ کیونکہ بالآخر برسوں سے خوابوں میں بسی ہوئی حسین وادی کی زیارت اب قریب تھی اور پھر اس وادی حسین میں قدم رکھتے ہی بے اختیار یہ مصرع زباں پر جاری ہو گیا:

ع اے قادیاں دار الاماں اونچا رہے تیرا نشاں

کچھ عرصہ پہلے منظوم کتاب ''دور خسروی'' از ثاقب زیروی جو گھر میں موجود تھی اور یہ آسان اور غنا سے بھرا ہوا مصرع زبانی یاد ہو گیا تھا کہ قادیان پہنچتے ہی اور بستی دیکھتے ہی یہ دعائیہ مصرع زبان سے جاری ہو گیا۔

نوعمری اور پھر سفر کی تکان اگلے چار پانچ دن کچھ سونے میں اور دن کے وقت جلسہ سالانہ سنتے ہوئے گویا یوں محسوس ہوا کہ پلک جھپکتے ہوئے گذر گئے۔ جلسہ کی تقاریر میں سے تو کوئی خاص بات ذہن میں محفوظ نہیں البتہ جلسہ گاہ کے منظر اور لنگر خانہ کے خورد ونوش کے انتظامات نے بہت متاثر کیا۔ قادیان میں چند روز قیام رہا۔ بڑے بھائی مولوی عبدالرحیم صاحب نے بعض بزرگوں اور اپنے اساتذہ سے ملایا کیونکہ وہ قبل ازیں چند سال قادیان میں تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ قادیان کے اہم مقامات کی زیارت کے بعد پٹھانکوٹ جو ضلع گورداسپور کی ایک تحصیل ہے اور جس کے صدر مقام کا نام پٹھانکوٹ ہے ہم دونوں وہاں چلے گئے۔ پٹھانکوٹ میں ہماری ہمشیرہ رہتی تھیں۔ واپس وطن لوٹنے سے قبل ان سے ملاقات ضروری تھیں۔ چند روز وہاں قیام رہا اور وہاں سے براستہ جموں واپس وطن لوٹنے کا پروگرام طے پایا۔ جموں سے اکھنور تک بذریعہ مسافر بس سفر طے ہوا۔ اکھنور سے راجوری شہر تک کا سفر پیدل طے کرنے کا پروگرام بنا تا کہ راستے میں جگہ جگہ قیام کی وجہ سے پیغام حق پہنچانے کے مواقع پیدا ہوتے رہیں۔ چند میل سڑک تھی اس کے بعد نشیب وفراز والا پہاڑی راستہ آ گیا۔ کہیں پست اور کہیں اونچے پہاڑ تھے۔ اسی قسم کے ایک پہاڑی راستہ پر جہاں صنوبر کے بلند و بالا درخت تھے سے اترائی پر سڑک کے کنارے ایک ٹین کا ڈبہ نظر آیا جو گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ الٹا پلٹا کر دیکھا صاف کیا اور کھولا تو اس میں گھی تھا۔ ویران جگہ تھی دور دور تک کوئی انسان نظر نہ آیا اور نہ ہی دور و نزدیک کوئی بستی نظر آئی۔ چونکہ اس سڑک سے دن میں ایک آدھ بار مسافر بس گذرتی تھی۔ اس لئے یہی اندازہ ہوا کہ کسی چلتی مسافر بس سے یہ ڈبہ گرا ہو گا۔ اور اب ضائع ہی ہو گا لہٰذا ہم نے ڈبہ کو اٹھا لیا اور چل پڑے۔ چند میل کا سفر طے کرنے پر ایک بستی آئی وہاں چند دکانیں بھی تھیں۔

ایک دوکاندار کے ہاتھ کچھ گھی بیچ دیا اور تھوڑا سا ساتھ لے لیا کہ سفر میں کام آئے گا اور دوران سفر اس گھی کو ''من وسلویٰ'' سمجھ کر استعمال میں لاتے رہے۔ راجوری شہر سے ہوتے ہوئے کم وبیش کوئی ایک ماہ بعد گھر پہنچے تو سارا علاقہ برف کی چادر میں لپٹا ہوا ایک عجیب اور خوشنما منظر پیش کر رہا تھا۔

3۔احمدیہ سکول چارکوٹ تحصیل راجوری:

اس بابرکت سفر کے بعد کچھ عرصہ گھر پر قیام رہا۔ بڑوں کی آپس میں گفتگو سے یہ معلوم ہوا کہ قادیان مجھے بھجوانے کے مقاصد میں ایک یہ بھی تھا کہ وہاں میری تعلیم کا کوئی انتظام ہوسکتا ہے یا نہیں اور کہ غالباً وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ فی الحال اس کا امکان نہیں۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ مزید تعلیم کے حصول کے لئے قصبہ چارکوٹ کے احمدیہ سکول میں داخلہ لیا جائے۔ اس قصبہ کی اکثر آبادی احمدیوں کی تھی۔ اور انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے مرکز سلسلہ کی مدد سے وہاں قصبہ میں ہی ایک سکول جاری کر رکھا تھا۔ اس سکول کو حکومت کی طرف سے بھی کچھ مالی مدد ملتی تھی۔ یہ سکول نہ صرف احمدی طلبہ کی تعلیم وتربیت کرتا تھا بلکہ علاقہ کے تمام باشندوں کے بچے اس سے مستفید ہوتے تھے۔ سکول میں ابتدائی سے آٹھویں کلاس تک تعلیم کا خاطر خواہ انتظام تھا۔ سکول حکومت جموں وکشمیر کی طرف سے منظور شدہ تھا اور حکومت کی طرف سے سالانہ گرانٹ بھی ملتی تھی۔

ان آٹھ درجوں کی تعلیم وتربیت مکرم ماسٹر بشیر احمد صاحب سکول کے ہی بعض سینئر طلبہ کی مدد سے سرانجام دیتے تھے۔ بڑے ہی شفیق انسان تھے۔ چونکہ سکول میں دور دراز سے آکر پڑھنے والوں کے لئے بورڈنگ کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لئے قریباً اڑھائی سال میرا قیام ان کے ساتھ ہی ان کی قیام گاہ پر رہا۔ ہر جمعرات کو سکول کے وقت کے بعد اپنے گاؤں دھوڑیاں بھاٹہ چلا جاتا اور ہفتہ کی صبح واپس آجاتا۔ اس طرح کم وبیش اڑھائی سال پڑھائی جاری رہی۔

آٹھویں کلاس شروع ہوئے چند ماہ ہی گذرے تھے اور سکول کے طلبہ موسم گرما کی تعطیلات پر تھے کہ 14 اگست 1947ء کو برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی اور ملک دو حصوں میں تقسیم ہوکر پاکستان اور بھارت کے ناموں سے دنیا کے نقشے پر ابھرے۔ ساتھ ہی ریاست جموں وکشمیر کا تنازع شروع ہوگیا۔ ریاست بھر کے سکول بند ہوگئے۔ راجوری اور پونچھ کے علاقے مع بعض دیگر بہت سے علاقوں کے محاذ

جنگ بن گئے۔ قریباً ڈیڑھ سال تک یہ حالت رہی کہ کبھی مجاہدین کشمیر اس علاقے پر قبضہ کر لیتے اور کبھی بھارتی فوج قبضہ کر کے بعض گھروں کو جن کے بارے میں اسے شبہ ہوتا کہ یہ مجاہدین کی قیام گاہ رہے ہیں یا قیام گاہ بن سکتے ہیں جلا کر راکھ کر دیتی۔ نومبر 1948 میں راجوری اور پونچھ کے شہروں کو جو تنازع شروع ہوتے ہی ایک دوسرے سے کٹ گئے تھے اور ان کے درمیاں خشکی کے ذریعہ کوئی رابطہ نہ تھا بلکہ صرف ہوائی جہاز کے ذریعہ رابطہ تھا، بذریعہ سڑک ایک دوسرے سے ملانے کی بھارتی فوج کی کوشش جو گذشتہ سال سوا سال سے مسلسل کر رہی تھی کامیاب ہوگئی۔ اس عرصہ میں پونچھ کا شہر مجاہدین کے محاصرے میں رہا اور شہر کی ہندو آبادی اور وہاں مقیم بھارتی فوج کو ہر شے کی سپلائی بذریعہ ہوائی جہاز ہوتی رہی۔ زمینی راستی مل جانے پر ان کی یہ مشکل دور ہوگئی۔ دونوں شہروں کو ایک دوسرے سے زمینی راستہ سے ملانے کے لئے بھارتی فوج نے اس عرصہ میں متعدد حملے کئے اور ہر حملے میں وہاں کی آبادی کو نقصان ہوا۔ لیکن اس آخری حملہ میں راستہ کی آبادی کو تہ تیغ کر دیا گیا گھروں کو جلا دیا گیا جو لوگ اس یلغار میں بچے وہ ہجرت کر کے موجودہ آزاد علاقے میں آگئے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ جنہوں نے ہجرت اختیار کی وہ زندہ رہے بہرحال اس یلغار اور خونی حملہ میں علاقے کے علاقے ویران ہوگئے۔

4۔زندگی وقف کرنے کی تحریک کیسے ہوئی:

حضرت مصلح موعود خلیفۃ المسیح الثانی کے ولولہ انگیز خطبات جمعہ سننے کا موقعہ ملتا جو عموماً مقامی مسجد میں جمعہ کے روز جمعہ کے خطبہ کے طور پر امام الصلوٰۃ پڑھ کر سناتا۔ پھر یہ کہ ہفتہ بھر کے 'روزنامہ الفضل' کے پرچے اکٹھے ہی ملتے کیونکہ ہمارے گاؤں جیسے دور دراز علاقوں میں روزانہ ڈاک کی تقسیم کا انتظام نہیں تھا۔ جب یہ اخبار ملتے تو بڑے شوق سے ان کا مطالعہ کرتا۔ اس زمانہ میں ان خطبات میں اشاعتِ اسلام کی خاطر زندگی وقف کرنے کی تلقین ہوتی تھی۔ ان ہی ایام میں ان پُر جوش اور ولولہ انگیز خطبات میں ایک جمعہ کی نماز پر خطبہ سن کر واپس لوٹا تو دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ کیوں نہ امام کے حضور اپنی زندگی اس مقدس کام کے لئے پیش کر دی جائے۔ اس تاثر کے تحت 1947ء کے شروع میں مرکز سلسلہ جو اس وقت قادیان میں تھا درخواست بھجوا دی کہ مَیں خدمت اسلام کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ جون 1947ء میں اس مضمون کا جواب موصول ہوا کہ وقف منظور ہے۔ تعلیم اپنی جاری

رہیں جب سلسلہ کوضرورت ہوگی آپ کو بلالیا جائے گا۔

تعلیم کا سلسلہ جاری تھا کہ اسی دوران تقسیم برصغیر کے نتیجہ میں تنازع کشمیر شروع ہو گیا۔اور اس تنازع کے شروع ہونے کی وجہ سے ریاست کے سکول بند ہو گئے اور وہاں تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو کر رہ گیا۔ ہمارے علاقہ کے تمام سکولوں کے ایسے طلبہ جو فوجی خدمات سرانجام دینے کے قابل سمجھے گئے انہیں چندروزہ فوجی تربیت دے کر محاذ جنگ پر بھیج دیا جاتا۔ ہماری کلاس کے طلبہ کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ آزاد فوج ہمارے علاقہ میں ہی کہیں تو خیمہ زن تھی اور کہیں لوگوں کے گھروں میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔اسی دوران کیپٹن بدرالدین صاحب جو راجہ جموں وکشمیر کی فوج سے دست بردار ہو کر آزاد فوج کے ساتھ مل کر راجہ کی افواج سے برسرپیکار تھے اور ہمارے علاقہ میں مقیم آزاد فوج کی کمان کر رہے تھے۔ان سے میری ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ بھی احمدی ہیں۔میل ملاقات نے جب طوالت پکڑی تو میں نے انہیں بتایا کہ میں نے اپنی زندگی سلسلہ احمدیہ کی خاطر وقف کی ہوئی ہے۔انہوں نے مشورہ دیا کہ آزادی کشمیر کی جدوجہد جاری ہے اور نہ جانے یہ کتنی طوالت اختیار کرے تم طالب علم ہو اور ابھی نوعمر ہو اس لئے تمہیں تعلیم جاری رکھنے کے لئے جامعہ احمدیہ میں داخل ہو جانا چاہئے۔ان کے اس صائب اور بروقت مشورے نے مہمیز کا کام کیا اور اس طرح ستمبر 1948ء میں مدرسہ احمدیہ میں داخلہ کی غرض سے لاہور پہنچا جہاں اس وقت سلسلہ عالیہ احمدیہ کے مرکزی دفاتر عارضی طور پر قائم تھے۔دفتر دیوان تحریک جدید میں میرا انٹرویو ہوا۔اور مدرسہ احمدیہ میں داخلہ حاصل کرنے کا اہل قرار پایا۔ اس وقت مدرسہ احمدیہ احمد نگر (نزد ربوہ) تحصیل چنیوٹ میں قائم تھا۔ چنانچہ ہدایت ملنے پر احمد نگر کے لئے روانہ ہوا اور داخلہ حاصل کیا۔یہ میرا دینی تعلیم کا باقاعدہ آغاز تھا۔مدرسہ احمدیہ میں تعلیم کے حصول کا آغاز ہی تھا کہ ہمارے علاقہ یعنی پونچھ میں ہندوستانی فوجوں نے پیش قدمی کر دی۔جس علاقہ سے فوج گذرتی لوگ ہجرت پر مجبور ہو جاتے۔اس طرح ہمارے گاؤں دھوڑیاں بھاٹہ کے لوگ بھی فوج کی پیش قدمی کی زد میں آ کر ہجرت پر مجبور ہوئے۔اکتوبر، نومبر 48ء میں ہجرت کر کے افتاں وخیزاں دن رات پیدل سفر کر کے بمقام کالا کیمپ جہلم پہنچ گئے۔مہاجروں کی حالت خراب تھی۔رہائش کا کوئی قابل ذکر انتظام نہ تھا۔علاج معالجہ نہ ہونے کے برابر تھا۔چنانچہ ان حالات میں ہمارے والد صاحب مارچ 49ء میں مختصر بیماری کے بعد وفات پا گئے۔

5- مدرسہ احمدیہ، جامعہ احمدیہ، جامعۃ المبشرین

ستمبر 1948ء کو مدرسہ احمدیہ میں داخلہ لیا۔مدرسہ اس وقت لاہور سے احمد نگر تحصیل چنیوٹ، ضلع جھنگ میں منتقل ہو چکا تھا۔احمد نگر میں مدرسہ جو جامعہ کا حصہ ہی تھا کی کوئی خاص عمارت نہ تھی بلکہ متروکہ جائیدادوں کے مکانات میں سے دو مکان حاصل کئے گئے تھے۔ایک مکان میں تدریس ہوتی تھی اور دوسرے میں ہوسٹل قائم تھا۔یہ مکانات علاقے کے متمول زمینداروں کے متروکہ تھے اور حویلیوں کے نام سے یاد کئے جاتے تھے اور ہر ایک میں عام رہائشی کمروں کے ساتھ ہی مویشیوں کے لئے بڑے بڑے ہال نما کمرے یا برآمدے تھے جنہیں صاف کر کے ایک مکان میں تدریس ہوتی تھی اور دوسرے میں ہوسٹل قائم کیا گیا تھا۔تعلیمی نصاب دو حصوں پر منقسم تھا ایک حصہ چار سال کے نصاب پر مشتمل تھا اور اس حصہ کی تدریس والا حصہ مدرسہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔اس کے نصاب میں ترجمۃ القرآن، منتخب احادیث، ابتدائی فقہ، عربی زبان اور اس کی گرائمر، اردو اور ابتدائی انگریزی زبان کی تعلیم ہوتی تھی۔دوسرا تعلیم کا حصہ دو سال کا تھا اور اس کی تدریس والی درسگاہ کو جامعہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ان دو سالوں میں مولوی فاضل جو بعد میں فاضل عربی کے نام سے موسوم ہوا کا نصاب پڑھایا جاتا تھا۔مولوی فاضل یا فاضل عربی کا امتحان پنجاب یونیورسٹی لیتی اور باقاعدہ سند دیتی جو گریجویشن کی ڈگری کے مساوی تصور ہوتی تھی اور اس زمانہ میں اس سند کی کافی اہمیت ہوتی تھی۔

یونیورسٹی سے یہ امتحان پاس کرنے کے بعد انجمن احمدیہ اور تحریک جدید کے منتخب افراد پر مشتمل ایک خصوصی بورڈ انٹرویو لیتا اور اس انٹرویو میں کامیابی پر مربی بننے کی خصوصی تعلیم وتربیت کے حصول کے لئے جامعۃ المبشرین میں داخلہ ملتا۔جامعۃ المبشرین میں تدریس وتہذیب تین سال، بشمول ایک سال طب یونانی ہوتی۔اس طرح مڈل سکول پاس طالب علم کو مربی بننے کے لئے نو سال تعلیم وتربیت حاصل کرنا ہوتی۔

میں نے 1954ء کے موسم بہار میں مولوی فاضل کا امتحان دیا۔امتحان کے نتیجے کے اعلان تک جامعہ میں پڑھائی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ میں کوٹلی، آزاد کشمیر چلا گیا۔وہاں قیام کے دوران نتیجے کا اعلان آنے پر اس وقت کے جامعہ کے پرنسپل مولانا محمد نذیر صاحب لائلپوری کی طرف سے مبارکباد کی چٹھی موصول ہوئی۔لکھا تھا کہ جامعہ احمدیہ کے مولوی فاضل کے امتحان میں کامیاب قرار دئے جانے والے طلبا

میں میری پہلی پوزیشن ہے۔ اس مبارک بادی کے پیغام کے ساتھ یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ مزید تعلیم جاری رکھنے کے لئے سلیکشن بورڈ کے پاس انٹرویو کے لئے حاضر ہو جاؤں۔ چنانچہ انٹرویو میں کامیاب قرار پانے پر مربی سلسلہ کے لئے جو خاص تعلیم و تربیت کا عرصہ مقرر تھا اس کے حصول کے لئے ستمبر 1954ء میں منتخب ہوا۔ دو سال خاص تعلیم جس کے نصاب میں تفسیر، حدیث، اصول فقہ، علم کلام اور موازنہ مذاہب قابل ذکر ہیں، حاصل کی اور امتحان میں کامیابی پر شاہد کی ڈگری حاصل کی۔ یہ ڈگری جماعت کے نظام تعلیم کی مقرر کردہ ہے۔ تخصص کے اس امتحان کے بعد ایک سال طب یونانی کی تعلیم کے حصول کے لئے مقرر تھا جو تبویب مسند احمد بن حنبلؒ کے سٹاف کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے حاصل نہ کر سکا۔ تاہم اپنی کلاس کے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ شاہد کی ڈگری کا حقدار قرار پایا اور 6 اکتوبر 1957ء کو مربی سلسلہ کے طور پر تقرر عمل میں آیا۔ اور ساتھ ہی بیرون پاکستان بھجوانے کے لئے منتخب ہوا۔

مدرسہ و جامعہ احمدیہ اور جامعۃ المبشرین میں جن اساتذہ کرام سے اردو، عربی اور انگریزی زبانیں اور علوم دینیہ تفسیر القرآن، حدیث، فقہ، منطق و فلسفہ اور علم کلام حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ان کے اسماء گرامی باب ''وے صورتیں.....'' کے شروع میں درج ہیں۔ ان میں سے بعض کا مختصر تعارف اور انتہائی قیمتی نصائح کا ذکر بھی درج ہے ایسی نصائح جن سے زندگی بھر استفادہ ہوتا رہا اور ساتھ ہی ان کی یادیں بھی تازہ رہیں اور ظاہر ہے یاد آنے پر ان کے درجات کی بلندی کے لئے دعائیں بھی ہوتی رہیں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین

تبویب مسند:

اس انتخاب سے ایک سال قبل جبکہ جامعۃ المبشرین میں تعلیم کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ اس دوران حضرت مصلح موعود نے مسند احمد بن حنبلؒ کی تبویب کی تحریک کی۔ تبویب کا کام شروع ہوتے ہی چند دوسرے زیر تعلیم طلبہ کے ساتھ مجھے بھی اس کام کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ مسند احمد بن حنبلؒ حدیث کی ایک ضخیم کتاب ہے لیکن اس کی تدوین و ترتیب حدیث کی دوسری مشہور کتب صحاح ستہ کی طرح فقہی طرز کے ابواب پر نہیں بلکہ ہر راوی کی تمام بیان کردہ احادیث ایک جگہ جمع کر دی گئی ہیں۔ اس ترتیب کی وجہ سے فقہ کے مسائل میں سے اگر کسی مسئلہ کے بارے میں حدیث دیکھنی ہو تو یہ ممکن نہیں یا کم از کم اس کی تلاش میں

بہت سا وقت لگتا ہے۔ آٹھ جلدوں پر مشتمل اس کتاب کی تبویب کا کام کچھ تو مولوی خورشید احمد صاحب جو بعد میں ایک لمبے عرصہ تک ربوہ کے صدر عمومی رہے کی زیر نگرانی ہوتا رہا اور بعد میں یہ کام مولوی ابوالمنیر نور الحق صاحب جو اس وقت ادارۃ المصنفین کے انچارج تھے کی زیر نگرانی تکمیل پذیر ہوا۔

عملہ تبویب 1956-1957

بائیں سے دائیں۔ میر غلام احمد نسیم، محمد صدیق گورداسپوری، ملک سیف الرحمان، حافظ مبارک احمد؟ شیخ عبدالواحد، مولوی بشیر، رشید احمد سرور، سید عبدالحی، مددگار کارکن

فرقان فورس میں خدمت:

اگست 1947ء میں برصغیر تقسیم ہوا اور دو ملک پاکستان اور بھارت قائم ہوئے۔ برصغیر کی نیم آزاد ریاستوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ دونوں ملکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ شامل ہو جائیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جغرافیائی محل وقوع کے ساتھ ساتھ وہاں بسنے والے باشندوں کی رائے کا بھی خیال رکھا جائے کہ وہ کس ملک کے ساتھ الحاق چاہتے ہیں۔ جموں و کشمیر کی آبادی کی اکثریت مسلمان تھی نیز جغرافیائی محل وقوع بھی ایسا تھا کہ اسے پاکستان کے ساتھ الحاق میں فائدہ تھا۔ لیکن اس نیم خود مختار ریاست کا حکمران جسے راجہ کہا جاتا تھا وہ ہندو تھا اور اس نے بھارت سے ریاست کے الحاق کو ترجیح دی۔ اس پر ریاست کے باشندوں نے اس کے فیصلہ کے خلاف آواز اٹھائی اور ریاست کا ایک حصہ پر قبضہ کر کے آزاد حکومت قائم

کر لی۔ اس پر بھارت نے اپنی باقاعدہ فوج ریاست کشمیر میں بھیج دی۔ دوسری طرف وہاں کے لوگوں نے اپنی آزادی کے لئے جدوجہد شروع کر دی اور وہاں کے نوجوانوں پر مشتمل ''آزاد فوج'' کے نام سے فوج تیار کر لی۔ چنانچہ اکتوبر 1947ء کو علاقہ میں جنگ آزادی شروع ہو گئی۔ کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کی حمایت میں پاکستانی عوام نے بھی دام، درمے، سخنے مدد کرنی شروع کی تو احمدیہ جماعت نے بھی ''فرقان'' کے نام سے رضا کاروں پر مشتمل ایک بٹالین ترتیب دی اور تحریک آزادی کشمیر کی انتظامیہ کے ساتھ رابطہ کر کے اسے ''باغ سر'' کے مقام پر جو اس وقت کے ضلع میر پور کی تحصیل بھنبھر میں واقع ہے متعین کر دیا۔ اس بٹالین میں نوجوان رضا کار ایک معین عرصہ کے لئے شامل ہو کر خدمات بجالانے کے بعد واپس آجاتے۔ جامعہ احمدیہ کے طلبہ موسم گرما کی رخصتوں میں یہ خدمت بجالاتے۔ چنانچہ 1949ء کی موسم گرما کی تعطیلات (جون، جولائی، اگست) میں ہمارا گروپ بھی محاذ پر گیا اور معمول کی فوجی ٹریننگ کے ساتھ ساتھ فوجی ڈیوٹی بھی دی۔

فرقان بٹالین کا مرکزی دفتر بمقام سرائے عالمگیر ضلع جہلم میں نہر اپر جہلم کے کنارے واقع تھا۔ رضا کار اس دفتر میں حاضر ہوتے، رجسٹریشن اور دیگر ضروری کارروائی کے بعد ریاست جموں و کشمیر میں اس وقت کی سیس فائر لائن کے قریب بمقام ''باغ سر'' جو اس وقت آزاد کشمیر کی انتظامیہ نے جماعت احمدیہ کی قائم کردہ فرقان بٹالین کے سپرد کیا ہوا تھا کہ وہ اس علاقہ کی حفاظت کرے۔ رضا کار وہاں مختصر فوجی تربیت حاصل کرتے اور ساتھ ہی فرنٹ لائن پر دن رات ڈیوٹیاں بھی بجالاتے۔

6- وطن سے بے وطن:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
(فیض احمد فیض)

برصغیر کی آزادی کا سورج 14 اگست 1947ء کو طلوع ہوا۔ اس مبارک تاریخ کے آنے سے کچھ روز قبل اور چند ماہ بعد جو قتل و غارتگری ہوئی وہ تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ برصغیر کی تقسیم سے دو ملک پاکستان اور بھارت وجود میں آئے۔ دونوں کی سرحدیں متعین ہونے کے دوران اور کچھ عرصہ بعد ان سرحدوں کی دونوں اطراف بے پناہ جانی اور مالی نقصان ہوا۔ اس نقصان اور قیامت صغریٰ برپا ہونے کی

داستان کو دہرانا مقصود نہیں۔ تاہم اس تقسیم کے نتیجہ میں ہم پر اور اہل کشمیر پر تنازع کشمیر پیدا ہونے کی بناء پر جو گذری اس کا ذکر کئے بغیر سرگذشت تکمیل کے مراحل طے نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اس کا مختصر ذکر ضروری ہے۔ پاکستان کے قیام کا اعلان ہوتے ہی تنازع کشمیری نے جنم لینا شروع کر دیا۔ لیکن اس کے ذکر سے قبل ریاست جموں و کشمیر کا مختصر تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مختصر تعارف جموں و کشمیر:

84471 مربع میل پر پھیلی ہوئی اور رقبہ کے لحاظ سے 110 آزاد ریاستوں اور آبادی کے لحاظ سے 131 ممالک سے بڑی ریاست جموں و کشمیر برِاعظم ایشیا کے قریباً وسط اور برصغیر پاک و بھارت کے عین شمال میں واقع ہے۔ اس لحاظ سے اسے ایشیا کا دل اور برصغیر کا تاج تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ تاریخ دان کشمیر کی تاریخ کو 5 ہزار قبل مسیح بتاتے ہیں۔ کشمیر میں مسلمانوں کی آمد کے نشانات 752ء سے ملتے ہیں۔ لیکن اسلام کی موثر اور عظیم تبلیغ کشمیر میں چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں شروع ہوئی۔ ریاست جموں و کشمیر کا سب سے پہلا مسلمان حکمران سلطان صدرالدین تھا۔ بعد ازاں مختلف ادوار میں کئی مسلمان خاندانوں نے کشمیر پر حکومت کی۔ ہندوستان میں مغلیہ دور حکومت کے دوران مغلوں نے 1583ء میں کشمیر پر کنٹرول حاصل کیا۔ مغلوں کے بعد افغان راج آیا۔ 1753ء میں احمد شاہ ابدالی نے کشمیر پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اس دوران کشمیر میں اسلام پھیلتا رہا تا آنکہ اکثر اہل کشمیر مسلمان ہو گئے۔ 1819ء میں سکھوں کی حکومت جموں اور اس کے گردونواح کے علاقہ پر قائم ہوئی۔ 18 مارچ 1846ء کو کشمیریوں کے ساتھ دردناک مذاق کیا گیا۔ ہندوستان کے قابض انگریز حکمرانوں نے کشمیر کو معاہدہ امرتسر کے ذریعہ جموں کے ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ 75 لاکھ روپے نانک شاہی سکہ کے عوض فروخت کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی کشمیر میں ظلم و استبداد کا دور شروع ہوا۔

برصغیر کی آزادی اور پاکستان کے قیام کے اعلان کے ساتھ ہی تنازع کشمیر شروع ہو گیا۔ چونکہ ریاست جموں و کشمیر میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ برصغیر کی تقسیم کی بنیاد ہندو اکثریت والے علاقے بھارت کا حصہ ہوں گے اور یہ کہ یہی اصول اور بنیاد برصغیر کی ریاستوں کے لئے بھی ہو گا۔ لیکن چونکہ ریاست جموں و کشمیر کا راجہ ہندو تھا اور قرائن بتا رہے تھے کہ اس کا جھکاؤ بھارت کی طرف ہے اور

توی امکان تھا کہ وہ بھارت سے ریاست کا الحاق کر دے گا۔اس خطرہ اور اندیشہ کے پیش نظر ریاست کے عوام میں بے چینی پیدا ہوئی اور عوام کے خدشہ کے عین مطابق بعد میں ایسا ہی ہوا۔تاہم اس دوران ریاست کے مسلمانوں نے ایک عارضی انتظامیہ بنا کر آزادی کا اعلان کرتے ہوئے پاکستان سے ریاست کے الحاق کا عندیہ دے دیا۔ دوسری طرف بھارت نے ریاست کے طول وعرض میں فوج بھیجنے کا اعلان کر دیا اور جہاں پر زمینی راستہ نہ تھا یا آزادی کے متوالوں نے کاٹ دیا تھا وہاں ہوائی جہازوں کے ذریعہ فوج اتاردی گئی اور اس طرح ریاست میں جنگ کے سے حالات پیدا ہو گئے۔

ریاست پونچھ:

جب ہم سکول کی ابتدائی کلاسوں میں پڑھتے تھے تو ہم ابتدائی جغرافیہ کے طور پر ریاست پونچھ کے نام سے آشنا تھے۔لیکن بعد میں ہمارا علاقہ ضلع پونچھ بن گیا۔ پونچھ کا علاقہ کسی زمانہ میں جموں کے راجے نے جاگیر کے طور پر ایک ہندوں خاندان کو دے دیا تھا اور اس نے اسے بھی ریاست کا نام دے دیا اس طرح گویا ریاست جموں وکشمیر کے اندر ایک اور ریاست قائم ہوگئی۔لیکن بعد میں انتظامی طور پر اسے ضلع بنا دیا گیا اور اب بھی ضلع پونچھ ہی کہلاتا ہے۔

ہمارے علاقہ پونچھ میں عجیب قسم کے حالات نے جنم لیا۔اس علاقہ میں قریباً 95فیصد مسلمان آباد تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں استعماری طاقتوں کو فوج کی ضرورت تھی اور اس غرض کے لئے فوجی قوت کو بڑھانے کے لئے انہوں نے نوجوانوں کو بھرتی کیا اور ایسے علاقوں کو منتخب کیا جہاں کے نوجوان جفاکشی ہوں اور ان کے آباؤ اجداد نے فوجی خدمات بھی بجالائی ہوں۔اس لحاظ سے ہمارا علاقہ بڑا زرخیز تھا۔ چنانچہ وہاں سے کثرت سے جوان بھرتی کئے گئے۔یہ عالمگیر جنگ حال ہی میں ختم ہوئی تھی اور بہت سے نوجوان فوج سے فارغ ہو کر واپس اپنے وطن کو لوٹے تھے۔اور بہت سے ابھی فوج میں ہی تھے۔ان سب نے باہمی مشاورت سے راجہ کی فوج کو علاقہ سے نکال باہر کرنے کا فیصلہ کیا۔چند ایک جھڑپوں کے بعد راجے کی فوج پسپا ہوگئی اور پونچھ، میر پور اور مظفر آباد کے اکثر علاقے آزاد ہو گئے۔لیکن پونچھ شہر میں بھارت نے طیاروں کے ذریعہ اپنی فوج اتار دی اور قبضہ کر لیا۔شہر کے بیرونی علاقے آزاد رہے اور شہر بھارتی فوج کے قبضہ میں چلا گیا۔شہر کو ضروریات زندگی کی اشیاء بھی بذریعہ ہوائی جہاز پہنچائی جانے لگیں۔ یہ صورت حال

سال بھر قائم رہی۔تا آنکہ 1948 کے موسم خزاں کے شروع ہوتے ہی بھارتی فوج نے پونچھ شہر سے زمینی راستہ قائم کرنے کے لئے ہمارے گاؤں سے جنوب مشرق کی طرف واقعہ قصبہ راجوری میں متعین فوج کے ذریعہ بہت بڑا حملہ شروع کر دیا۔ ہمارے دیہات راجوری اور پونچھ شہر کے عین درمیان واقع تھے اور فوج کی پیش قدمی کا یہی راستہ تھا۔ بھارتی فوج آبادیوں کو تاراج کرتی ہوئی برابر آگے بڑھ رہی تھی اسے ہوائی تحفظ بھی حاصل تھا۔مجاہدین نے مقدور بھر مقابلہ کیا لیکن وہ زمینی اور ہوائی حملوں کی تاب نہ لا سکتے تھے لہٰذا پسپائی پر مجبور ہو گئے۔ ہماری آبادیاں ویران ہونی شروع ہو گئیں۔رات کے اندھیروں میں لوگ بے سروسامانی میں محفوظ جگہوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔جس کسی کو جدھر کا راستہ ملا یا اسے یہ خیال آیا کہ اس طرف جانے سے گنوں اور بندوقوں کے فائر سے محفوظ رہیں گے ادھر ہی چل پڑے۔اس طرح بے سروسامانی کی حالت میں پہاڑوں اور وادیوں کو پاپیادہ طے کرتے ہوئے کشمیر کے اس حصے میں جو ''سیز فائر'' کے بعد آزاد کشمیر کہلایا پہنچ گئے اور کچھ اسی دھکم پیل اور منزل متعین نہ ہونے کی وجہ سے نئی قائم شدہ مملکت خداداد پاکستان کے علاقہ جہلم وراولپنڈی کے اضلاع میں پہنچ گئے۔

اس افراتفری کے عالم میں ہمارے خاندان کے اکثر افراد افتاں وخیزاں، ضلع جہلم میں بمقام چک جمال کے کیمپ میں جو مہاجرین کے لئے حکومت پاکستان نے قائم کیا تھا، آکر قیام پذیر ہو گئے۔کیمپ میں پہنچنے کی خبر ملی، ملاقات کے لئے وہاں گیا۔مہاجرین کی حالت سخت ابتر تھی۔لوگوں کا اژدہام تھا سر چھپانے تک کے لئے چھت میسر نہ تھی۔خوراک کا کوئی قابل ذکر انتظام نہ تھا اور علاج معالجہ نہ ہونے کے برابر۔اس پر مزید یہ کہ کشمیر میں جنگ آزادی جاری تھی اور مزید مہاجرین کے قافلے شب وروز آرہے تھے۔

عزیز واقارب کو اس حالت میں دیکھ کر والد صاحب میاں صلاح محمد صاحب کی منصوبہ بندی یاد آگئی۔انہوں نے چند سال قبل ہی مزید زرعی اراضی حاصل کی تھی اور رہائشی سہولتوں میں اضافہ کیا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے لئے ہی وہ کر رہے تھے۔ہم چھ بھائی اور چار ہماری بہنیں تھیں۔ بھائیوں میں سے ایک بھائی اور دو بہنوں کی شادی میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔شادی شدہ بھائی کے بچے بھی تھے۔والد صاحب کی خواہش تھی کہ وہ اپنی حین حیات میں ہی ہمارے رہائشی وسائل جس قدر ممکن ہو سکے پیدا کر دیں اور معاشی وسائل بھی زیادہ سے زیادہ مہیا ہو جائیں تا ان کے اس دنیا سے گذر جانے کے بعد ہم آسودہ حال ہوں۔معاش کے لئے چند ایکڑ زرعی زمین تھی۔اس کے علاوہ مویشی پالے

جاتے تھے جن میں بھیڑ، بکری، گائے اور بھینس شامل تھیں۔ ہمیں دینی تعلیم گھر پر ہی وہ خود دیتے اور عام تعلیم بھی جہاں تک حالات اجازت دیتے ہمیں دلانے کی کوشش کرتے۔ علاقہ میں سکول نہ ہونے کی وجہ سے عام تعلیم زیادہ تو ہم حاصل نہ کر سکے لیکن لکھنے پڑھنے کی حد تک ہم سب ہی تعلیم یافتہ کہلاتے تھے۔

جب حالات نے پلٹا کھایا جن کا مختصر ذکر ہو چکا ہے تو سب کچھ تیاگ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چونکہ ہجرت کا سفر پا پیادہ تھا اس لئے سوائے پہننے کے کپڑوں، ایک آدھ کمبل اور مختصر زادراہ کے اور کچھ بھی ہمراہ نہ لایا جا سکا۔ اجڑی بستی اور ویران آشیانیں اور عمر بھر کی کمائی 'کبیر' کے اس شعر کی عملی تصویر پیش کر رہے تھے:

تنکے چن چن محل بنایا سب کہیں گھر میرا
نہ گھر میرا نہ گھر تیرا چڑیا رین بسیرا

(کبیر بھگت)

بہر کیف کیمپ کی حالت انسانی صحت کے لئے کسی صورت بھی موزوں نہ تھی۔ انسانوں کے انبوہ نے ماحول کو بہت خراب کیا ہوا تھا۔ بیمار پڑنے پر کسی خاطر خواہ علاج کا انتظام نہ تھا کیمپ میں چند ماہ قیام کے بعد والد صاحب کی صحت خراب ہوگئی اور بیماری نے آ لیا۔ اور یہی بیماری جان لیوا ثابت ہوئی اور 2 مارچ 1949ء کو جان جانِ آفرین کے سپرد ہوگئی۔

ع رہے باقی نام اللہ

الوداع اے قافلے والو! ایک واقعہ:

جامعہ میں موسم گرما کی تعطیلات ہر سال کم و بیش دو ماہ ہوا کرتی تھیں۔ یہ تعطیلات گذارنے اکثر کوٹلی آزاد کشمیر جاتا۔ قصبہ کوٹلی میں ہمارے کچھ مہاجر رشتہ دار قیام پذیر تھے۔ کشمیر کے مہاجر عجیب مخمصے میں پھنسے ہوئے تھے قیام پاکستان کے وقت جو لوگ بھارت سے ہجرت کر کے آئے تھے انہیں حکومت پاکستان نے پاکستان کے مختلف علاقوں میں آباد کر دیا تھا کہ اب وہ پاکستان کے مستقل باشندے ہیں اور انہیں اب کہیں نہیں جانا۔ دوسری طرف مہاجرین کشمیر کی حالت عجیب و غریب تھی۔ حکومت پاکستان یہ امید لگائے بیٹھی تھی کہ کشمیر چونکہ متنازع علاقہ ہے اور اس کا جلد فیصلہ ہوگا اور یہ لوگ واپس اپنے وطن یعنی کشمیر منتقل ہو

جانا نہیں ہے اور اب ان کا قیام خطۂ پاکستان میں عارضی ہے۔ ادھر اقوام عالم نے بھی یہ فیصلہ دیا کہ کشمیر ایک متنازع علاقہ ہے اور یہ تنازع کشمیری عوام کے رائے سے حل کیا جائے گا۔ عوام کی رائے حاصل کی جائے گی کہ وہ پاکستان اور بھارت میں سے کس ملک کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں حکومت پاکستان بھی گومگو کی حالت میں تھی اور مہاجرین کشمیر بھی یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ جلد فیصلہ ہوگا اور ہم اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔ اس حالت امید و بیم میں ان کے دن مہینوں اور سالوں میں بدل رہے تھے۔ ان مہاجرین کے قیام اور طعام کا بھی کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ یہ لوگ انتہائی پریشانی اور بے یقینی کے عالم میں وقت گذار رہے تھے۔ بھارت نے ریاست جموں و کشمیر میں شیخ عبداللہ جو برصغیر کی آزادی سے قبل مسلمانانِ کشمیر کا مقبول راہنما تھا وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا گیا تھا اور خط متارکہ جنگ جو اقوام عالم نے قائم کیا تھا اس کی نگرانی کسی حد تک ڈھیلی کر دی گئی تھی گو کہ اسے عبور کرنا غیر قانونی تھا لیکن اگر کوئی چوری چھپے عبور کر لے تو اس سے صرفِ نظر کیا جاتا تھا۔ دوسری طرف لوگ حالات سے سخت نالاں تھے اور ادھر یہ امید کہ انہیں جلد یا بدیر واپس اپنے وطن جانا ہوگا اور کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کی مقبوضہ علاقہ میں جائیدادیں جو وہ چھوڑ آئے ہیں تباہ ہو جائیں گی۔ اس لئے بعض نے بامر مجبوری واپسی کی کوششیں شروع کر دیں۔

1951ء کی موسم گرما کی تعطیلات میں مَیں کوٹلی میں تھا کہ ہمارے چند قریبی رشتہ داروں نے بھی واپسی کا فیصلہ کیا۔ جب وہ کوٹلی شہر سے گذرے تو مَیں بھی اِن کے ساتھ ہولیا۔ پا پیادہ ان کے ساتھ کئی میل کا سفر طے کیا اور جب ان سے رخصت ہونے لگا تو اس خیال نے آن دبوچا کہ یہ عزیز ایسے علاقہ میں جا رہے ہیں جہاں آنے جانے کا مستقبل قریب میں کوئی امکان نہیں اور یہ بھی واضح نہیں کہ یہ امکان کب تک ممکن ہو سکے گا تو آنکھیں پُرنم ہو گئیں اور کسی شاعر کا شعر جو غالبًا ایسے موقع کے لئے ہی موزوں ہوا ہوگا بے ساختہ زبان سے جاری ہو گیا:

الوداع اے قافلے والو مجھے اب چھوڑ دو
میری قسمت میں لکھی ہیں دشت کی ویرانیاں

7- ازدواج:۔

تعلیم سے فارغ ہوتے ہی عملی زندگی کی تگ و دو شروع ہوگئی۔ زمانہ طالبعلمی کی دوستیاں،

تعلقات اور بے فکری سب ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگیں۔ کشمکش حیات کے نئے زاوئے وا ہونے لگے۔ دفتر میں پہنچتے ہی افسران اور نئے لوگوں سے روابط کا آغاز ہونے لگا۔ حیات مستعار ایک مستقل کشمکش ہے۔ ایک مسئلہ حل ہوتا ہے تو دوسرا منہ کھولے سامنے ہوتا ہے۔ ابھی تعلیم کا مسئلہ حل ہوا ہی تھا کہ رشتہ داروں اور ہمدردوں کو ایک اور فکر نے آلیا اور وہ میری خانہ آبادی کی جستجو میں لگ گئے۔ لیکن خانہ تو کب کا برباد ہو چکا تھا۔ جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب بھی مستقبل قریب میں کسی ٹھکانے یا گھر کی کوئی امید نہیں تھی۔ تعلیم کے دوران ہوسٹل میں قیام تھا لیکن اب انہوں نے بھی آنکھیں بدل لی تھیں اور اب رہائش کا کوئی قابل ذکر بندوبست نہیں تھا پھر بھی کوئی نہ کوئی آ جاتا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں اور پھر چلا جاتا۔ زندگی 27 بہاریں دیکھ چکی تھی۔ بے سروسامانی کی وجہ سے پہلے تو دل مائل نہ ہوتا تھا لیکن آہستہ آہستہ سوچ میں تبدیلی آنے لگی۔ ہماری دو بہنیں جو ربوہ میں تھیں کسی کے بتانے پر ایک گھر گئیں۔ لیکن واپسی پر انہوں نے کسی خوش فہمی کا اظہار نہ کیا۔ تاہم انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر اس گھر میں رشتہ طے ہو جائے تو بہتر ہوگا کیونکہ خاندان دیندار ہے اور رہن سہن بھی مناسب ہے۔

اس کے بعد کئی ہفتے گذر گئے کہ اچانک ایک روز ربوہ کے گولبازار سے گذرتے ہوئے ہمارے ایک مہربان استاد جو مخالف سمت سے آ رہے تھے۔ مجھے بلایا اور فرمایا کہ آپ کی بہنیں ایک مرتبہ تشریف لائیں تھیں اور جس مقصد کے لئے وہ آئیں تھیں اس کے بارے میں فریق ثانی نے اطمینان کر لیا ہے اور اگر وہ بھی مطمئن ہیں تو وقت مقرر کر کے کسی روز تشریف لے آئیں اور بات پکی کر لیں۔ اس طرح سلسلہ جنبانی شروع ہوا جو مختصر اور غیر متوقع بھی تھا۔ تاہم تمام معاملات طے پانے کے بعد سب مراحل خوش اسلوبی سے طے پا گئے۔ چنانچہ 14 جولائی 1958ء کو مسمات امۃ المنان قمر بنت مولوی چراغ دین کے ساتھ رشتہ ازدواج تمام تر شرعی تقاضوں کے مطابق قائم ہوا۔ اپنے خاندانی حالات اور جماعت احمدیہ سے وابستگی کی روداد کا جستہ جستہ ذکر ہو چکا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زوجہ محترمہ کے خاندان اور احمدیت سے وابستگی کا کچھ ذکر ہو جائے۔

زوجہ محترمہ ددھیال کی طرف سے بھٹی قوم سے ہیں۔ والد کا نام مولوی چراغ دین تھا۔ جب وہ احمدی ہوئے تو ان کے خاندان نے ان سے قطع تعلق کر لیا انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح اول سے ذکر کیا اور یہ بھی کہا کہ وہ اب تنہا ہی رہتے ہیں۔ حضور کی تحریک پر ان کا رشتہ سیکھواں کے کشمیری خاندان میں ہوا۔ لہٰذا

ننھیال کا تعلق سیکھواں کے کشمیری خاندان سے ہے یہ خاندان قادیان کے نواح کے قصبہ سیکھواں نامی میں قیام پذیر تھا اور کسی زمانہ میں نامساعد حالات کی بناء پر کشمیر سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہو گیا تھا۔ حضرت مسیح موعودؑ کے مامور من اللہ ہونے کے دعوی کے ابتدائی ایام میں ہی اس خانوادہ کے تین بھائی جماعت احمدیہ میں شامل ہو گئے اور اس وقت کے مطابق مالی و حالی خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی پاکیزہ تحریرات میں کئی مقامات پر ان کا ذکر کیا ہے۔ اشتہار ''جلسۃ الوداع'' میں فرمایا:

> ''......اخویم حکیم مولوی نور الدین صاحب نے ایک آدمی کے لئے ایک طرف کا خرچ دے دیا ہے اور اخویم منشی عبدالعزیز صاحب پٹواری ساکن اوجلہ ضلع گورداسپور نے باوجود قلت سرمایہ کے ایک سو پچیس روپیہ دئے ہیں اور میاں جمال الدین کشمیری ساکن سیکھواں ضلع گورداسپورہ اور ان کے دو برادر حقیقی میاں امام الدین اور میاں خیر الدین نے پچاس روپیہ دئے ہیں۔ ان چاروں صاحبوں کے چندے کا معاملہ نہایت عجیب اور قابل رشک ہے کہ وہ دنیا کے مال سے نہایت ہی کم حصہ رکھتے ہیں گویا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرح جو کچھ گھروں میں تھا وہ سب لے آئے ہیں اور دین کو آخرت پر مقدم کیا جیسا کہ بیعت میں شرط تھی......''

(جلسۃ الوداع۔ ضمیمہ اشتہار الانصار 4 اکتوبر 1899ء بحوالہ مجموعہ اشتہارات جلد 3 صفحہ 167-166)

حضرت مسیح موعودؑ کے اس ارشاد کے بعد ان ہر سہ بھائیوں کے بارے میں کسی رائے کا اظہار کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ البتہ یہ ذکر بے سود نہ ہوگا کہ انہوں نے اپنی اولاد کی ایسی تربیت کی کہ ان میں سے بعض نے سلسلہ احمدیہ کی خدمت کا حق ادا کر دیا۔ ان میں سے مولانا جلال الدین شمس صاحب ابن امام الدین صاحب جنہیں ان کی خدمات کی وجہ سے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے 'خالد احمدیت' کے خطاب جلیلہ سے نوازا اور مولوی قمر الدین صاحب ابن خیر الدین صاحب قابل ذکر ہیں۔ اس خاندان کی اگلی نسل میں بھی خدمت دین کا جذبہ موجزن ہے۔ اس نسل کے بعض افراد وقف زندگی ہیں اور خدمت میں مصروف ہیں اور دیگر بھی حسب استعداد دام درمِ سخنے خدمت بجا لا رہے ہیں۔ خدا کرے یہ جذبہ نسل در نسل چلتا رہے اور خدمت دین کی توفیق انہیں تا ابد حاصل ہوتی رہے۔ اس خاندان کا مختصر شجرہ درج ہے۔

محمد صدیق

جمال الدین | امام الدین | خیر الدین

محمد اسمعیل | سارہ بیگم زوجہ چراغ دین | مولانا جلال الدین شمس | مولوی قمر الدین

مولوی نور الدین منیر | امۃ الرشید شوکت | صالحہ صولت | حبیب احمد | امۃ المنان قمر زوجہ میر غلام احمد نسیم

ڈاکٹر امۃ الشکور | ڈاکٹر میر شریف احمد | ڈاکٹر مہہ جبین | ڈاکٹر میر مقبول احمد
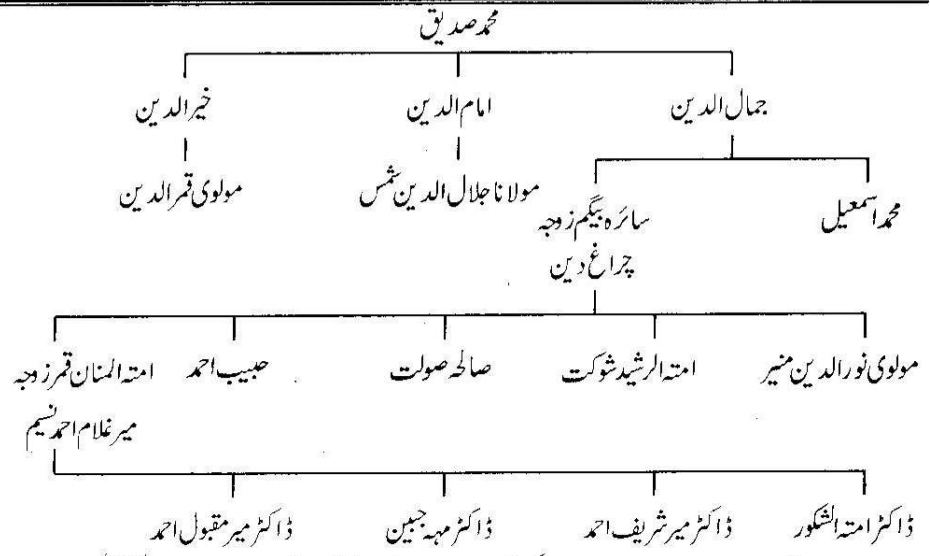
زوجہ محترمہ نے اپنی والدہ سارہ بیگم کی سیرت پر ایک مضمون لکھا جو روزنامہ الفضل ربوہ میں 6 مارچ 1997ء کو شائع ہوا۔ اس مضمون میں اپنی والدہ کے بارے میں لکھا کہ انہیں اپنی اولاد کو تعلیم دلانے کا بڑا شوق تھا۔ ان کی ہمیشہ یہ دعا ہوتی کہ بچے تعلیم حاصل کر کے دین کی خدمت کریں۔ چنانچہ ان کے بچوں نے تعلیم بھی حاصل کی اور بعض کو دین کی خدمت کی توفیق بھی ملی۔ اس مضمون میں وہ اپنے بارے میں لکھتی ہیں:۔

''میری شادی کے بعد جب میرے میاں میر غلام احمد صاحب نسیم مربی سلسلہ کو بیرون ملک بھجوایا تو مجھے یہ سوچ کر خوشی ہوتی تھی کہ میری امی گو وہ اس وقت دنیا میں موجود نہ تھیں، لیکن ان کی روح کو یقیناً مسرت محسوس ہوتی ہوگی کہ ان کے داماد کو دین حق پہنچانے کا تقریباً گیارہ سال ☆ موقعہ ملا، مربی سلسلہ کی وہ بہت قدر داں تھیں۔

مجھ کو بھی اللہ تعالیٰ نے جب سے مَیں نے ہوش سنبھالا ہے کسی نہ کسی رنگ میں خدمت کرنے کا موقعہ دیا ہے۔ علاوہ بچوں کی تدریس کے دو سال لجنہ مرکزیہ میں صحتِ جسمانی کی سیکرٹری رہی ہوں اور چالیس سال سے شعبہ صنعت و دستکاری کی نائب سیکرٹری ہوں۔ اسی طرح میری بڑی بیٹی ڈاکٹر امۃ الشکور اور اس کے میاں ڈاکٹر عبد الحفیظ کو نصرت جہاں کے تحت تنزانیہ میں خدمت کا موقعہ

ملا ہے۔ اس سے قبل وہ چھ سال گیمبیا میں بھی کام کرتے رہے ہیں۔

میرے دونوں بیٹے ڈاکٹر میر شریف احمد اور ڈاکٹر میر مقبول احمد کو امریکہ میں سیکرٹری تحریک جدید و وقف جدید اور چھوٹے بیٹے کو ناظم اطفال کے طور پر خدمت کا موقعہ مل رہا ہے۔ چھوٹی بیٹی ڈاکٹر مہہ جبین لاہور میں اپنے حلقہ کی جنرل سیکرٹری کا کام کر رہی ہے۔'' (روزنامہ الفضل ربوہ 6 مارچ 1997ء صفحہ 6)

☆ گیارہ سال سے مراد بیرون پاکستان کی خدمت ہے ورنہ وہ ساری عمر خدمت سلسلہ کبھی داعی الی اللہ کے طور پر اور کبھی تدریس جامعہ احمدیہ کے طور پر کرتے رہے اور کرتے ہیں۔

باب سوم

بطور مربی تقرر برائے سیر الیون
(Sierra Lone)

1958ء میں سرالیون 'مغربی افریقہ' کے لئے بطور مربی نامزدگی ہوئی اس وقت حکومت پاکستان کا محکمہ پاسپورٹ بڑی چھان بین کے بعد پاسپورٹ جاری کرتا تھا۔ مربیوں کے لئے پاسپورٹ کا حصول اور دیگر سفر کے انتظامات وکالت تبشیر تحریک جدید کے ذمہ تھے۔ درخواست بھجوائے کئی ماہ گذر گئے اور باوجود یاددہانیوں کے کوئی جواب نہ آیا۔ کسی ذریعہ سے پتہ کروایا تو معلوم ہوا کہ فائل نہیں مل رہے اور نہ ریکارڈ سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ فائل کس کو بھجوائی گئی ہے۔ اس لئے نئی درخواست بھجوائی جائے۔ یہ اطلاع ملنے پر نئی درخواست بھجوادی گئی۔

پاسپورٹ کے حصول کا طریقِ کار کچھ یوں تھا کہ پاسپورٹ کے دفتر کو جو ان دنوں لاہور تھا، درخواست بھجوائی جاتی۔ دفتری کارروائی کے بعد درخواست ضلع کے ڈی۔سی۔ کے دفتر میں بھجوادی جاتی۔ ڈی۔سی کا دفتر متعلقہ تھانہ کے ذریعہ تفتیش مکمل کرواکر واپس بھجواتا اور پھر کہیں جا کر پاسپورٹ جاری ہوتا تھا۔ ہم دو مربی تھے جن کی درخواستیں دفتر تبشیر نے اکٹھی بھجوائی تھیں۔ اور اب دوبارہ بھی ہم دونوں کی درخواستیں بھجوادی گئیں۔ جب دوسری مرتبہ دی گئیں درخواستیں ڈی۔سی کے دفتر میں پہنچیں تو انہیں معلوم ہوا کہ ان ہر دوافراد کی پاسپورٹ کے حصول کی درخواستیں پہلے بھی آچکی ہیں۔ اور قواعد کے مطابق دوسری درخواست پہلی کا حوالہ دئے بغیر دائر کرنا جرم ہے جس کی سزا دو سال قید یا جرمانہ ہے۔ چنانچہ اس قاعدے کے تحت ڈی۔سی کی طرف سے ہم دونوں کے نام سمن جاری ہو گئے اور ضلع جھنگ کے مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوکر اپنا موقف بیان کرنے کی ہدایت ملی۔ چنانچہ ہم دونوں خاکسار اور مولوی نذیر احمد حیدر آبادی پیش

ہوئے تو ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے وکیل ابھی تک نہیں پہنچے۔ ان حالات میں ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں جو کچھ معلوم ہے وہی بیان دیں گے۔ جب مجسٹریٹ نے ہمیں پوچھا کہ پاسپورٹ کے حصول کے لئے آپ نے دوسری درخواست پہلی کا حوالہ دئے بغیر دی ہے تو ہم نے کہا کہ ہم تحریک جدید صدر انجمن احمدیہ کے ملازم ہیں۔ ہمارے پاسپورٹ بنوانے کا کام ادارہ کے سپرد تھا اور کہ درخواستیں ان کے ذریعہ ہی بھجوائی گئی تھیں۔ ہمیں ذاتی طور پر یہ علم نہیں تھا کہ بوجوہ دوسری درخواست پہلی درخواست کا حوالہ دئے بغیر دینا جرم ہے۔ اسی دوران ہمارے وکیل بھی پہنچ گئے۔ ہمارا بیان سننے کے بعد مجسٹریٹ نے ہم سے پوچھا آپ کو کیا سزا دی جائے۔ اس پر ہمارے وکیل نے کہا کہ جناب ان کو علم نہیں تھا لہٰذا انہیں معاف کر دیں۔ اس پر سماعت ختم ہوگئی بعد میں پتہ چلا کہ مجسٹریٹ ہماری صاف گوئی سے بہت متاثر ہوا اور صرف تین تین روپے بطور ٹوکن جرمانہ کیا۔

یہ بھی ذکر کرتا چلوں کہ دوسری درخواست بھجوائے بھی جب کئی ہفتے گذر گئے تو مجھے لاہور کسی کام کے سلسلہ میں جانے کا اتفاق ہوا تو پاسپورٹ کے دفتر بھی گیا اور پاسپورٹ افسر سے ملا۔ اس نے ریکارڈ منگوایا تو میری طرف سے بھجوائی گئی کسی درخواست کا پتہ نہ چل سکا۔ اس پر اس نے کہا کہ آپ کی درخواست مل نہیں رہی ایک اور درخواست کا فارم پُر کر دیں۔ یہ بات میں نے دفتر تبشیر کے متعلقہ کارکن کو بتائی تو انہوں نے ایک تیسری درخواست بھجوادی۔ جب ہم جھنگ سے پیشی بھگتا کر واپس آئے تو مجھے اطلاع ملی کہ میرا پاسپورٹ دفتر تبشیر کو موصول ہو گیا ہے۔ گویا اس تیسری درخواست پر مجھے پاسپورٹ جاری ہوا۔ دوسری درخواست دیتے ہوئے پہلی درخواست کا حوالہ نہ دینے پر معمولی جرمانہ ہوا تھا لیکن پھر بھی پاسپورٹ حاصل کرنے میں وقتی روک ضرور تھا۔ چنانچہ اس کیس میں شامل دوسرے مربی کو کئی سال بعد پاسپورٹ جاری ہوا۔

برّ اعظم افریقہ کے بارے میں بچپن کی سنی سنائی کہانیوں کی وجہ سے ذہن میں جو تصور تھا وہ کچھ زیادہ خوشکن نہ تھا۔ اور باتوں کے علاوہ تصور میں ایک صحرائی حصہ ارض اور اس سے متعلقات تھے۔ جب مغربی افریقہ کے ملک سیر الیون میں خدمات بجالانے کے لئے تقرر ہوا تو بچپن سے سنی سنائی سب باتیں ایک ایک کر کے ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ تاہم روشن پہلو یہ تھا کہ ایک نیک اور بلند مقصد کے لئے جانا تھا۔ یہ مقصد اتنا عظیم ہے کہ اس کے لئے ہمارے اسلاف نے جانیں قربان کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ ایک پلڑے میں سنی سنائی کہانیاں اور دوسرے میں اعلیٰ و ارفع مقاصد تھے۔ مقاصد والا پلڑا ہر بار وزنی

معلوم ہوا۔ دھیرے دھیرے روانگی کا دن بھی آ گیا۔ روانگی سے قبل بعض بزرگوں سے مل کر قیمتی نصائح حاصل کرنے اور دعا کی درخواست کرنے کا ارادہ کیا۔ بعض کو گھر بلانے کی توفیق ملی۔ ہماری درخواست پر گھر آنے والوں میں حضرت مولانا جلال الدین صاحب شمس قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا موصوف مختلف ممالک میں دینی خدمات بجا لانے کے علاوہ ایک جید عالم تھے۔ انہوں نے میدان عمل کے بعض سبق آموز تجربات بیان فرمانے کے ساتھ ساتھ نصائح سے بھی نوازا۔ حضرت مولانا غلام رسول راجیکی صاحب کو ملنے ان کے گھر حاضر ہوا۔ انہوں نے بہت مفید نصائح سے نوازا۔ استاذی المکرّم مولانا ابوالعطاء صاحب جالندھری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے مشفقانہ مشوروں اور نصیحتوں کے علاوہ کچھ کتب کے نام بتائے کہ ان سے میدان عمل میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اس دور میں روانگی ربوہ ریلوے اسٹیشن سے بذریعہ ریل گاڑی ہوا کرتی تھی۔ ریل گاڑی 'چناب ایکسپریس' صبح نو، دس بجے روانہ ہوتی تھی۔ بیرونِ پاکستان جانے والے مربی کو الوداع کرنے کے لئے کثرت سے احباب اور دفتر کے کارکنان ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جایا کرتے تھے۔ اس طرح اچھا سماں بندھ جاتا اور اجتماعی دعا کے ساتھ روانہ ہونے والے مجاہد کو رخصت کیا جاتا۔ چنانچہ اسی روایت کے مطابق 19 نومبر 1960ء کو ربوہ ریلوے اسٹیشن پر الوداعی تقریب ہوئی۔ احباب و اعزّہ سے گلے ملنے کے بعد کراچی کے لئے روانگی ہوئی۔ جہاں سے چند دن قیام کے بعد بذریعہ ہوائی جہاز سیرالیون روانہ ہونا تھا۔ کراچی میں جماعت کراچی کی طرف سے قیام وطعام کا انتظام تھا۔ اس وقت مکرم شیخ خلیل الرحمان صاحب کراچی جماعت کے سیکرٹری ضیافت تھے انہوں نے ایک اچھے ہوٹل میں قیام کا انتظام کیا ہوا تھا۔ اس دوران سلسلہ کے دو بزرگ مولوی قمرالدین صاحب اور مولوی غلام احمد فرخ صاحب بھی تشریف لے آئے۔ ان کا قیام بھی اسی ہوٹل میں تھا۔ مولوی قمرالدین صاحب بڑے باذوق بزرگ تھے۔ جب ان سے پوچھا جاتا کہ کیا تناول فرمائیں گے تو اکثر ''مرغ کڑاہی'' کا نام لیتے۔ ان کے ہمراہ بہت اچھا وقت گذرا۔ وہ چونکہ جماعت کی طرف سے تربیتی دورے پر تھے اور انہوں نے مختلف حلقوں کے تربیتی دورے کرنے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ چلا جاتا۔ تربیتی کام اور طریق کار کا اندازہ ہوتا اور ساتھ ہی ساتھ ہماری اپنی تربیت بھی ہوتی رہی۔

کراچی سے سیرالیون براستہ روم:

اس دور میں پاکستانی باشندوں کے لئے دولت مشترکہ کے ممالک کے لئے قبل از وقت ویزا حاصل کرنا ضروری نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ دولت مشترکہ کے جس ملک جانا وہاں پہنچنے پر ویزا مل جاتا تھا۔ روم کے ہوائی مستقر سے دوسرے ہوائی جہاز پر اگلے روز روانہ ہونا تھا۔ اس طرح روم میں ایک دن کا قیام تھا۔ جب اگلے دن ہوائی مستقر پہنچا تو ائیر پورٹ پر چیک کرنے والے کارندے نے بتلایا کہ سیرالیون کا ویزا نہیں ہے اس لئے آپ نہیں جا سکتے۔ کافی گھبراہٹ ہوئی یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اب کیا کرنا ہے۔ میری پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے اسی کارندے نے روم میں قائم پاکستانی ایمبیسی کو فون پر رابطہ قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے اسے بتلایا کہ میرے پاس نہ پاکستانی ایمبیسی کا ایڈریس اور نہ ہی فون نمبر ہے۔ اس پر اس نے خود فون نمبر ملا کر مجھے دیا۔ دوسری طرف سے بولنے والے کو تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں احمدی مربی ہوں۔ ہمارا مشن سیرالیون میں موجود ہے اور یہ کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے پاکستانی باشندوں کو پیشگی ویزا حاصل کرنے کی ضرورت نہیں لیکن ائیر پورٹ کے کارندے کو قائل نہیں کر سکا اور اس کی وجہ زبان بھی ہے کیونکہ میں لاطینی زبان سے نابلد ہوں۔ ادھر سے جواب ملا کہ فون چیک کرنے والے افسر کو دوں۔ افسر نے فون پر بات چیت کرنے کے بعد مجھے لاؤنج میں جانے کی اجازت دی۔

2- احمدیہ مسلم مشن سیرالیون:

29 نومبر 1960ء کو ہواؤں کے دوش پر سوار ہوئی جہاز جب سیرالیون کے بین الاقوامی مستقر پر اترا تو دل خدا کی حمد سے لبریز تھا کہ اس ذات باری نے اس مشت خاک کو دین متین کی خدمت کی توفیق سے نوازا ہے۔ سیرالیون احمدیہ مسلم مشن گذشتہ کئی عشروں سے مصروف عمل تھا۔ ابتداء میں وہاں پہنچنے والے مربیان کرام نے بڑے مشکل حالات میں کام کیا تھا۔ 1960ء میں مشن کے حالات اگرچہ پہلے سے بہتر تھے لیکن تسلی بخش پھر بھی نہ تھے۔ اس وقت امیر اور مربی انچارج شیخ نصیرالدین احمد تھے جو بیک وقت امیر، مربی انچارج، جنرل مینجر احمدیہ سکولز اور نئے قائم ہونے والے احمدیہ سیکنڈری سکول آف 'بو' کے پرنسپل بھی تھے۔ اور یہ سب خدمات وہ بخوبی سرانجام دے رہے تھے۔ مشن کی سرگرمیوں میں ان کے ساتھ اس وقت

قریشی محمد افضل، مولوی محمد صدیق گورداسپوری، مولوی غلام نبی اور مکرم سمیع اللہ سیال شریک کار تھے۔ افریقہ میں کام کرنے کا چونکہ یہ میرا پہلا موقعہ تھا اس لئے قریشی محمد افضل صاحب کے ساتھ مجھے ملک کے طول وعرض کی جماعتوں کے دورے پر بھجوا دیا گیا۔ قریشی صاحب محترم کافی عرصہ افریقہ کے مختلف ممالک میں کام کر چکے تھے اور ان کا اس میدان میں کافی وسیع تجربہ تھا۔ ہم دونوں نے تمام قابل ذکر جماعتوں کے دورے کئے۔ جہاں احمدیہ سکول قائم تھے وہاں بھی پہنچے۔ سکولوں کے اساتذہ کے رسمی تعارف کے علاوہ ہر علاقہ کے شعبہ تعلیم کے افسران سے بھی ملاقاتیں کیں۔ قریشی صاحب افریقہ کے مختلف ممالک کے قیام کے دوران کے اپنے وسیع تجربات بھی جستہ جستہ بیان کرتے۔ افریقہ کے دیہاتوں میں قیام کی صورت میں مقامی خوراک استعمال کرتے ہوئے کن کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے وغیرہ باتوں سے آگاہ کرتے رہے۔ ان میں سے قابل ذکر یہ امر تھا کہ دیہاتوں میں چونکہ پینے کا صاف پانی نہیں ملتا اس لئے ابلا ہوا پانی استعمال میں لانا مفید رہتا ہے۔ وہ خود اپنے ہمراہ چھوٹے سے تھرماس میں تیار کردہ چائے بغیر دودھ ملے رکھتے اور بوقت ضرورت پانی کی جگہ بھی وہی چائے استعمال کرتے۔ اس دورے سے واپسی کے جلد بعد وہ واپس پاکستان چلے گئے لیکن ان کے تجربات سے حاصل شدہ دی گئیں ہدایات وہاں قیام کے دوران بہت مفید ثابت ہوئیں۔

جماعت احمدیہ سیرالیون کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ احمدیہ مشن کو اس ملک میں قائم کرنے اور اسے مضبوط بنیادیں مہیا کرنے والوں میں سے ایک مربی مولوی نذیر احمد علی صاحب وہیں مدفون ہوئے اور اسی سرزمین پر ان کا مزار ہے۔ 'بو' شہر کے قریبی قبرستان میں مدفون ہیں۔ وہاں جانے والا ہر مربی بلکہ احمدی ان کے مزار پر دعا کے لئے حاضری کو اپنے لئے سعادت خیال کرتا ہے۔ مولوی صاحب نے جن حالات میں پیغام حق ملک کے دور افتادہ علاقوں میں پہنچایا نہایت ہی قابل قدر اور قابل ستائش ہے۔ سیرالیون پہنچنے پر ایسے احباب سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا جنہوں نے ان کے ساتھ کام کیا تھا اور وہ وہاں کے مقامی احباب تھے۔ ان میں سے بعض نے بتلایا کہ بعض دور دراز کے علاقوں میں جہاں اس وقت پہنچنے کے لئے کوئی سڑک نہ تھی اور نہ ہی کوئی اور ذریعہ سواری کا تھا انہوں نے پاپیادہ سفر کئے۔ ایسے مقامات پر بھی گئے جہاں صاف پانی بھی پینے کو نہیں ملتا تھا اور پھر کئی دن قیام کیا اور مقامی لوگوں سے رابطے کئے۔ یہ بھی بتایا کہ وہ ایسے مقامات پر ٹھہرتے اور جہاں مسلمان ہوتے ان کے امام الصلوٰۃ سے ملتے۔ پیغام حق پہنچاتے۔ اعتراض سنتے اور جب تک اختلافی مسائل کے سلسلہ میں ان کی تسلی نہ ہو جاتی وہیں قیام پذیر رہتے۔ حوالہ

جات کے لئے ضروری کتب ہمراہ ہوتیں تا معترض کی تسلی وتشفی کے لئے اسے حوالہ دکھا سکیں۔

ایک مرتبہ کینما (Kenama) کے علاقہ کے دورے کے دوران ایک دور دراز کے گاؤں کا ایک آدمی ملا اور بتایا کہ ہمارے گاؤں میں احمدی ہیں جنہوں نے کئی سال قبل مولوی نذیر احمد علی صاحب کے وہاں کے دورے اور قیام کے وقت احمدیت قبول کی تھی۔ لیکن کئی سال ہوئے وہاں کوئی مرکزی مربی نہیں گیا۔ مقامی مربی صاحب کبھی کبھار دورہ کرتے ہیں چنانچہ اس کے ساتھ اس گاؤں جانے کا پروگرام بنا۔ کچھ راستہ تو بذریعہ ایک ٹرک طے ہوا۔ کچھ وہاں کی مقامی کشتی جسے کینو (Canoe) کہا جاتا ہے، کے ذریعہ دریا میں سفر ہوا اور پھر وہاں سے پیدل چل کر گاؤں پہنچے۔ گاؤں کے اردگرد نہایت گھنا جنگل تھا۔ ان بلند وبالا درختوں کے درمیان چھوٹا سا گاؤں تھا۔ وہاں کے احباب نے بتایا کہ یہاں مولوی نذیر علی صاحب کئی دن قیام پذیر رہے اور جب گاؤں میں جماعت قائم ہوگئی تو وہاں سے واپس گئے۔ اس گاؤں کے علاوہ اس علاقہ میں قیام کے دوران جہاں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ لوگوں نے یہی بتایا کہ یہاں بھی مولوی صاحب موصوف آئے تھے اور قیام پذیر بھی ہوئے تھے۔ لوگوں کے بیانات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کا طریق تبلیغ بہت سادہ ہوتا تھا۔ جہاں سواری نہ ملے وہاں پیدل بھی سفر کر لیتے تھے۔ ساتھ کسی نوجوان احمدی کو لے لیتے تھے کہ جب سامان خصوصاً حوالہ کی کتب اٹھا کر لے جانی پڑیں تو وہ مددگار ہو سکے۔ اس طرح انہوں نے ملک کے طول وعرض کا کئی مرتبہ سفر کر کے پیغام حق پہنچانے کی پوری پوری کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے۔

موٹر کار بہتے ہوئے نالے میں جا گری:

سیرالیون کے مشرقی صوبے کینما (Kenama) میں تعلیم وتبشیر کے کام میں مصروف تھا کہ ایک روز اچانک اطلاع موصول ہوئی کہ مربی انچارج مکرم بشارت احمد بشیر صاحب جو ان دنوں نئے نئے پاکستان سے تشریف لائے تھے اور مکرم سمیع اللہ سیال صاحب علاقہ کی جماعتوں کے تربیتی دورے پر تشریف لا رہے ہیں اور کینما سے مجھے بھی ہمراہ لے کر بعض دور دراز کی دیہاتی جماعتوں کا دورہ کریں گے۔ نیز مزید احمدیہ سکول قائم کرنے کا جائزہ بھی لیں گے۔ حسب پروگرام ہم تینوں کینما کے مضافات میں واقعہ ایک گاؤں کی جماعت کے دورے سے واپس آ رہے تھے۔ سڑک کچی تھی اور اس پر طرفہ تماشا یہ کہ بارش ہو رہی

تھی۔موٹر کار معمول کی رفتار سے رواں دواں تھی کہ موڑ کاٹتے ہوئے ایک بڑے پانی کے بہتے ہوئے نالے پر بنے ہوئے پل کی برجی سے ٹکرا کر نالے میں جا گری اور پانی میں غوطے کھانے لگی اور اس کا انجن بند ہوا تو رک گئی اور اس کا دروازہ جو گرنے سے ٹیڑھا ہو کر کھل گیا تھا اور اوپر کی طرف آ گیا تھا اس سے ہم کار سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔زندہ بچ جانے پر خدا تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ادا کیا۔

جس جگہ موٹر کار پانی کے نالے میں گری تھی اس کے قریب ہی ایک بستی تھی۔آواز سن کر وہاں سے چند لوگ آ گئے اور انہوں نے ہمیں باہر نکالا اور موٹر کو رسے ڈال کر نالے کے کنارے واقع درختوں سے باندھ دیا اور پولیس کو حادثہ کی اطلاع دی۔پولیس جب جائے واردات پر پہنچی تو بعد معائنہ کے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ ایسے خطرناک حادثہ میں کوئی جان تلف نہ ہوئی ہو۔آپ لوگ سب تفصیلات بتانے سے گریز کر رہے ہیں۔کافی بحث و تمحیص کے بعد نصف شب کے قریب جا کر انہوں نے ہمیں جانے کی اور موٹر کو گیراج میں مرمت کے لئے منتقل کرنے کی اجازت دی۔

3- احمدیہ سکول بو(Bo) میں بطور ہیڈ ماسٹر تعیناتی:

سیرالیون میں دعوت الی اللہ کا کام کرتے ہوئے کچھ عرصہ ہی گذرا تھا کہ وکالت تبشیر ربوہ پاکستان، نے مشن سیرالیون کی انتظامیہ میں بعض تبدیلیاں کیں، مکرم بشارت احمد بشیر نئے مشنری انچارج مقرر ہوئے۔انہوں نے چارج سنبھالتے ہی بعض نئے کام شروع کئے جن کے لئے فنڈز کی ضرورت تھی۔ انہوں نے وہاں کام کرنے والے مربیان کرام کی تعلیم کا جائزہ لیا اور سب سے دریافت کا کہ ان میں سے کسی کے پاس بی۔اے کی سند بھی ہے تا اسے ٹیچر مقرر کروایا جا سکے۔چونکہ میری تعلیم مولوی فاضل اور شاہد کی ڈگری کے ساتھ بی۔اے تک تھی اور میرے پاس بی۔اے کی سند بھی تھی۔انہوں نے مجھ سے اسناد منگوائیں۔مجھے علم نہ تھا کہ کس غرض کے لئے منگوائی ہیں۔بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے محکمہ تعلیم سے مشورہ کرنے کے بعد یہ قدم اٹھایا۔انہوں نے محکمہ تعلیم سے معلوم کیا تھا کہ آیا پنجاب یونیورسٹی کی بی۔اے کی ڈگری کو سیرالیون میں بھی بی۔اے کی ڈگری ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔محکمہ نے سند وغیرہ دیکھنے کے بعد بتایا کہ یہ بی۔اے کی ہی ڈگری ہے اور اس کا حامل گریجویٹ ہی ہے۔البتہ ایم۔اے اور ایم ایس سی کے گریجویٹ سے تنخواہ میں تھوڑا سا فرق ہے۔بہر کیف محکمہ تعلیم نے مجھے گریجویٹ تسلیم کر کے بطور ہیڈ ماسٹر احمدیہ سکول 'بو'

میں تقرری کی منظوری دے دی اور نوے (90) پونڈز سٹرلنگ ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔لیکن مشن میں میری پوزیشن بطور مربی کے ہی رہی اور مربی کا الاؤنس جو پانچ پونڈز ماہوار تھا مجھے ملتا رہا اور بقیہ رقم پچاسی (85) پونڈز مشن کے فنڈز میں بطور چندہ وضع ہوتے رہے۔حکومت کو ہر ماہ دو چیک بھجوایا جاتا کہ میں نے نوے پونڈز تنخواہ وصول کر لی ہے۔خوشی اس بات کی تھی کہ مشن نے جو دعوت الی اللہ کے کاموں کو آگے بڑھانے کے نئے کام شروع کئے ہیں ان کے لئے فنڈز مہیا ہونے کے نئے ذرائع پیدا ہو رہے ہیں۔اور اس طرح ہمیں بھی ثواب کے مواقع حاصل ہو رہے ہیں۔

قریباً دو سال تک جماعتی تعلیم و تربیت کے کاموں کے ساتھ ساتھ احمدیہ سکول 'بو' میں بطور ہیڈ ماسٹر خدمت کا موقعہ ملا۔اس دوران سیرالیون کے تمام احمدیہ سکولوں کے جملہ انتظام، بحیثیت جنرل مینیجر سکولز کئے جاتے رہے۔سکولوں کی سہ ماہی رپورٹ حکومت کے محکمہ تعلیم کو بھجوائی جاتی۔اساتذہ کے تبادلے اور تقرریاں کی جاتیں اور تعلیمی حالت کی نگرانی بھی کی جاتی۔دو سال کے عرصہ میں تین نئے سکول قائم ہوئے اور متعدد کی اپ گریڈنگ ہوئی۔ان گونہ گوں فرائض کے ساتھ ساتھ تعطیلات میں جماعتوں کی تربیت کے لئے دورے بھی کئے جاتے جس کے نتیجہ میں کئی نئے افراد کو جماعت میں شامل ہونے کی سعادت نصیب ہوتی رہی۔

احمدیہ سکولوں کی عمومی نگرانی کی وجہ سے محکمہ تعلیم کے افسران سے عموماً رابطہ رہتا۔ان روابط کے مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں اسلام اور احمدیت پر مفت لٹریچر دینے کے علاوہ بعض قیمتی کتب بطور تحفہ بھی پیش کی جاتیں۔ایسے افراد سے دوبارہ ملاقات پر اسلامی تعلیمات اور جماعت احمدیہ کی مذہبی اور انسانی خدمات کا تذکرہ ہوتا اور اس طرح حق کا پیغام پہنچانے کے مواقع میسر رہتے۔شعبہ تعلیم سے منسلک ہونے کی وجہ سے سرکاری اور عیسائی مشنوں کے سکولوں سے بھی رابطہ رہتا اور انہیں بھی اسلامی تعلیمات اور احمدیہ مشن کی مذہبی اور انسانی خدمات سے آگاہ کیا جاتا۔چنانچہ اس عرصہ میں تعلیم یافتہ طبقہ تک پیغام حق پہنچانے کے مواقع میسر رہے اور ان موقعوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی مقدور بھر کوشش کی جاتی رہی۔وما توفیقی الا باللہ۔

احمدیہ سکول بو (Bo) میں خدمات کے اعتراف میں متعلقہ صوبے کے انسپکٹر آف سکولز نے خوشنودی کا اظہار کیا اور اپنی چٹھی محررہ 16 اکتوبر 1963ء میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا: ترجمہ:

''غلام احمد نسیم نے احمدیہ مسلم سکول بو(Bo) جو جنوبی صوبہ میں واقعہ ہے میں 1960ء تا 1963ء خدمات سرانجام دیں۔اس عرصہ میں انہوں نے سکول میں

متعدد نئی تبدیلیاں متعارف کرائیں جن کی وجہ سے سکول میں تدریس اور عمومی نگرانی بہتر ہوئی۔ نسیم صاحب کا سکول کے تدریسی سٹاف پر نہایت ہی عمدہ کنٹرول رہا۔ استاد اور طلبہ انہیں اچھا جانتے تھے۔ طلبہ کے والدین اور نگرانون کے ساتھ تعلقات خوشگوار اور نہایت اچھے رہے۔ ہم ان کی آئندہ زندگی میں کامیابی کے متمنی ہیں۔''

From: Inspector of Schools Southern Province, BO.
To: Whon It May Concern

16th October 1963

TESTIMONIAL

This is to certify that Ghulam Ahmad Nasim Has Served as Headmaster of the Ahmadiyya Muslim Primary School at BO, In the Southren Province From 1960 to 1963. During this period he held the School tosether and introduced several new changes which improved teaching at the school and the general organisation.

Mr. Nasim's control of his staff was excellent and he was loved by teachers and pupils alike. His relationship with the parents and guardians of the pupols was most cordial.

We wish him success in the years ahead.

Inspector of Schools,
South Province

ایک درویش کی سبق آموز داستان

سیرالیون قیام کے دوران مشن کی دیگر ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ احمدیہ مڈل سکول بو (Bo) میں بطور ہیڈ ماسٹر بھی کچھ عرصہ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس دوران اکثر قیام بو شہر میں ہی رہتا۔ بو میں ایک مقامی دوکاندار تھا۔ چھوٹی سی دوکان پر کھانے پینے کی اشیاء اور مشروبات مثلاً کوکا کولو وغیرہ فروخت کرتا۔ ہمارے مشن ہاؤس کے قریب ہی اس کی یہ دکان تھی۔ کبھی کبھار شام کے فارغ وقت میں اس کے پاس ہم چلے جاتے۔ بیٹھنے کے لئے چند پرانی سی کرسیاں بھی تھیں۔ ایک مرتبہ اس نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ

اس دوکان کے علاوہ اس کی مین بازار میں ایک مارکیٹ بھی ہے اور کہ وہ بازار کا مصروف ترین علاقہ ہے۔ متعدد دکانیں ہیں جو کرایہ پر اٹھا رکھی ہیں۔ یہ سن کر خوشگوار حیرت ہوئی اور پوچھا کہ پھر آپ اس قدر سادگی کی زندگی کیوں اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یہ چھوٹی سے گھریلو قسم کی دوکان جو رہائشی مکان کے ایک حصہ پر مشتمل ہے کیوں چلا رہے ہیں۔ کہنے لگا تا کہ اپنا ماضی اور اپنی اصل یاد رہے۔ وضاحت کرتے ہوئے گویا ہوا کہ اس کے والدین اس کے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے اور وہ یتیم رہ گیا تھا۔ جب ہوش سنبھالا تو غربت اور افلاس کے ہاتھوں تنگ تھا۔ کوئی سہارا نہ تھا چنانچہ کام کی تلاش میں نکل پڑا۔ کوئی کام نہیں مل رہا تھا۔ اسی حالتِ پریشانی اور سرگردانی میں ساحل سمندر پر جا نکلا اور پھر فری ٹاؤن (Free Town) کی بندرگاہ پر پہنچ گیا۔ وہاں پر ایک بہت بڑا جہاز لنگر انداز تھا۔ ایک آدمی سے ملاقات ہوئی۔ علیک سلیک کے بعد اس نے یوں بے مقصد گھومنے کی وجہ پوچھی۔ بتایا کہ یتیم اور بے سہارا ہوں اور ساتھ ہی بے روزگار بھی۔ کسی کام کی تلاش ہے۔ وہ کہنے لگا جہاز پر کام کرو گے۔ جواب دیا کہ کوئی کام جس جگہ اور جیسا بھی ہو کرنے کے لئے تیار ہوں۔ چنانچہ اس نے جہاز کے کپتان سے بات کر کے اس بحری جہاز میں چھوٹا موٹا کام کرنے کے لئے بھرتی کر لیا۔ یہ پہلی ''جنگ عظیم'' کا زمانہ تھا۔ جہاز نے لنگر اٹھایا اور ملکوں ملکوں گھومتا رہا۔ کبھی امریکہ کی کسی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا اور پھر روانہ ہو گیا۔ اسی طرح کئی سال گذر گئے اور عنفوان جوانی کی دہلیز پار کر کے شعور کی عمر کو پہنچ گیا۔

جنگ ختم ہوئی تو ملازمین کی چھانٹی کا وقت آن پہنچا۔ جہاز کی کمپنی نے فارغ ہونے والے ملازمین کو ان کی خدمات کے صلہ میں کچھ معاوضہ دینے کا فیصلہ کیا اور حساب کر کے مناسب رقم دے کر گھر بھیجنے کا حتمی فیصلہ ہو گیا۔ اس طرح اسے یکمشت ایک معقول رقم مل گئی۔ چونکہ اسے کسی قسم کی بری عادت مثلاً شراب نوشی یا اسی قسم کی کوئی عادت نہیں تھی جس کی نذر یہ رقم ہو جاتی چونکہ وہ یتیمی کی وجہ سے غربت اور بھوک کی تکالیف سے دوچار ہو چکا تھا۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ غربت کی زندگی کی تکالیف کس قدر جان لیوا ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ رقم کسی بہتر مصرف میں لگانی چاہئے۔ سوچ بچار کے بعد اس نے اس رقم سے تجارت شروع کی اور نتیجہ کے طور پر اب وہ اچھی خاصی شہری جائیداد کا مالک ہے۔ اس نے اپنی یتیمی، غریبی اور پھر متمول اور خوشحال زندگی سے حاصل شدہ تجربات سے اخذ کردہ سبق کی گفتگو اس نتیجہ پر ختم کی کہ

''انسان کو تیراک بننے کے لئے سمندر میں غوطہ زن ہو جانا چاہئے۔ اگر

قسمت نے یاوری کی اور تیر کر دوسرے کنارے پہنچ گیا تو کامیاب اور اگر ڈوب کر خدا
کے پاس چلا گیا تو بھی گھاٹے کا سودا نہیں۔"

اس کی داستان کے بیان کرنے اور انداز اور طرز بیان پر مجھے کسی کا یہ شعر یاد آ گیا:

کشتی کو خدا پہ چھوڑ بھی دے کشتی کا خدا خود حافظ ہے
مشکل تو نہیں ان موجوں میں بہتے ہوئے ساحل آ جائے

جب انسان حالات سے مجبور ہو جائے تو حالات کا مقابلہ کرنے اور انہیں بدلنے کے لئے جدو جہد کے سمندر میں غوطہ زن ہو جائے۔ اگر حیات نے وفا کی تو وہ بحر بے کراں کو عبور کر کے کامیابی سے ہمکنار ہو گا اور اگر عبور نہیں کر سکا اور اسی تگ و دو میں جان جان آفرین کے سپرد ہو گئی تو بھی سودا گھاٹے کا نہیں کہ معاشی حالت جائز طریق سے بہتر بناتے ہوئے چل بسنے والا بھی ثواب کا مستحق قرار پاتا ہے۔ لیکن جو ڈوبنے کے خوف سے جدو جہد کے سمندر میں غوطہ ہی نہیں لگاتا بلکہ کنارے پر ہی بیٹھا رہتا ہے وہ وہیں بیٹھا ہوا ہی رہ جائے گا۔ کیا خوب کسی نے کہا ہے:

یہ بزم مئے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

4- سیرالیون سے واپسی:

او یار رب حوالے میلے چار دناں دے

سیرالیون میں کام کرتے تین سال ہونے کو آئے اور وطن واپس جانے کا وقت قریب آ گیا۔ ان تین سالوں میں مختلف کام سپرد رہے نذیر احمدیہ پرنٹنگ پریس واقعہ احمدیہ مسلم مشن بو (Bo) کی نگرانی کے ساتھ ساتھ جماعتی کام از قسم تعلیم و تربیت اور دفتری خط و کتابت بھی سرانجام پاتے رہے۔ کچھ عرصہ ملک کے مشرقی صوبے کے صدر مقام کینما میں قیام رہا اور تبشیر و دعوت کا کام کیا۔ وہاں قیام کے دوران دور دراز علاقوں کے دورے کئے۔ بعض مقامات پر نئی جماعتیں قائم ہوئیں۔ بعض مقامات پر افراد جماعت تو موجود تھے لیکن باقاعدہ تنظیمیں نہ تھیں انہیں منظم کر کے ایک لڑی میں پرو کر جماعت کی تمام تنظیمیں قائم کی گئیں۔

کینما میں کچھ عرصہ خدمت کرنے کے بعد احمدیہ سکول بو (Bo) میں بطور ہیڈ ٹیچر تقرری ہوگئی۔

اس دوران متعدد دیگر کام بھی سپرد رہے۔ تمام احمدیہ سکولوں کی عمومی نگرانی اور اساتذہ کی تقرری اور تبادلوں کے دوران بعض انوکھے اور دلچسپ واقعات بھی پیش آتے رہے۔ انوکھے اس لئے کہ جس معاشرہ سے اپنا تعلق تھا اس میں اس قسم کی بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان واقعات میں ایک کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔ موسمی تعطیلات کے دوران مشن کی طرف سے اساتذہ کی نئی آسامیوں پر تقرری کے لئے درخواستیں طلب کی گئیں۔ متعدد درخواستیں موصول ہوئیں۔ درخواست کنندگان کو انٹرویو کے لئے طلب کیا گیا۔ اس دوران ایک غیر مسلم خاتون امیدوار کے کوائف کا جائزہ لینے کے بعد جب ہر لحاظ سے موزوں سمجھا تو ایک گاؤں کے سکول کے لئے نامزد کرتے ہوئے اسے وہاں جانے کے لئے کہا۔ اس نے وہاں جانے سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ دو معصوم بچے ہیں اس لئے وہ اتنی دور ان کو لے کر نہیں جا سکتی۔ اس کے پُر کردہ فارم کے کوائف پر دوبارہ نظر ڈالی تو شادی کے خانے میں غیر شادی شدہ درج تھا۔ استفسار پر اس نے بتایا اس کی تجرباتی (Trial) شادی سے دو بچے ہیں۔ حیرانی سے انٹرویو لینے والوں میں شامل دوسرے دو افراد کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہے تھے۔ کہنے لگے کہ ہمارے معاشرے میں خصوصاً غیر مسلموں میں ایسا ہوتا ہے اور اسے برائی تصور نہیں کیا جاتا۔

سکولوں کے اشغال اور دعوت الی اللہ کے کاموں میں برابر مصروفیت کی وجہ سے وسیع تعلقات قائم ہوئے حتیٰ کہ بعض افراد کے تعلقات نے دوستیوں کا روپ دھار لیا۔ ادھر واپس پاکستان روانگی کا وقت آن پہنچا۔ احمدی احباب اور دیگر ایسے دوستوں سے جن سے دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے ان سے جدائی کا جب خیال آتا تو پنجابی کے صوفی شاعر میاں محمد بخش کا شعر:

او یار رب حوالے میلے چار دناں دے
او دن عید مبارک ہوسی جس دن آن ملا گے

جو ایسے مواقعوں کی عین تصویر پیش کرتا ہے یاد آ جاتا۔ لیکن سیرالیون کے احباب سے جدائی کے بعد پھر وہ دن جو عید مبارک ہوتا اور بچھڑنے والوں سے ملاقات ہوتی دوبارہ نہ آیا کیونکہ دوبارہ اس ملک جانے کا اتفاق نہ ہوا بلکہ دوسرے بعض ملکوں میں خدمت کے مواقع نصیب ہوتے رہے۔ تاہم ان احباب کو جن سے ملاقات رہی تھی ساری عمر بھلا نہ سکا اگرچہ جسمانی رابطہ دوبارہ نہ ہو سکا لیکن روح کا رابطہ تا زیست قائم رہا اور جو بقید حیات ہیں ان سے ہے اور ہمیشہ ان کے لئے دست بدعا رہا اور جب بھی موقع ملا

سلامتی اور نیک تمناؤں کا پیغام پہنچاتا رہا اور وصول بھی کرتا رہا۔

ان تین سالوں میں تعلیم و تربیت کے کام کے ساتھ ساتھ دعوت الی اللہ کے کام کے نتیجہ میں کئی سعید روحیں روحانی سلسلہ میں داخل ہوئیں۔ سکولوں کی نگرانی کے نتیجہ میں جہاں تک یاد پڑتا ہے اس عرصہ میں دو نئے سکول بھی قائم ہوئے اور ان کے قیام کے جملہ انتظامات کی سعادت خدا تعالیٰ کے بے پایاں فضل سے نصیب ہوئی۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ بلکہ محض فضل ایزدی تھا۔

سیروافی الارض:

حصول تعلیم کا شوق شعور کی عمر کو پہنچنے کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ جامعہ احمدیہ کی عظیم مذہبی درسگاہ میں مذہبی تعلیم کے حصول کے ساتھ مروجہ تعلیمی ڈگریاں حاصل کرنے کا شوق بھی پروان چڑھتا رہا۔ سب سے اول جامعہ احمدیہ کے چند دیگر طلبہ کے ساتھ مل کر ''مولوی'' جو عربی زبان و ادب میں پنجاب یونیورسٹی کا ابتدائی امتحان ہوتا ہے نمایاں درجے میں پاس کیا۔ پھر 1954ء میں باقاعدہ جامعہ احمدیہ کی طرف سے پنجاب یونیورسٹی کا مولوی فاضل کا امتحان نمایاں درجہ میں پاس کیا۔ اس سال جامعہ احمدیہ کی طرف سے شامل ہونے والے طلبہ میں اول رہا جس پر اس وقت کے پرنسپل قاضی محمد نذیر فاضل صاحب لائلپوری (فیصل آباد) نے تہنیت کا خط لکھا کیونکہ موسمی تعطیلات کی وجہ سے قصبہ کوٹلی، آزاد کشمیر میں تھا۔ بعد ازاں وکالت دیوان، تحریک جدید میں بلا کر ایک فارم پُر کروایا گیا کہ اب تمہیں 'جامعۃ المبشرین' میں مزید تین سال تعلیم کے لئے منتخب کر لیا گیا ہے اور یہ تین سالہ نصاب مکمل کرنے پر اور اس کا امتحان پاس کرنے پر شاہد کی ڈگری کے حقدار ہو گے۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ تعلیمی ڈگریوں کے حصول کا بھی شوق تھا اس لئے اسی دوران ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا اور پھر بی۔ اے کی ڈگری بھی پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کر لی۔ جس سال ہم نے بی۔ اے کا امتحان دینا تھا اس سال بی۔ اے کے انگریزی زبان کے نصاب میں مشہور ڈرامہ نگار شیکسپیر کے دو ڈرامے بھی شامل تھے۔ جس میں سے ایک ڈرامہ میک بیتھ تھا۔ اس ڈرامہ کو پڑھتے ہوئے ایسے محسوس ہوتا کہ جو کچھ اور جیسے حالات میں ڈرامہ نگار کہہ رہا ہے وہ عین فطرتی ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی یہ تصور پیدا ہوتا کہ کتنا بڑا ڈرامہ نگار ہے بلکہ فطرت نگار کہنا چاہئے۔ پھر ساتھ ہی خیال

آتا کہ اس کے وطن کو دیکھنا چاہئے لیکن شائد اسے دیکھنا ہماری قسمت میں نہ ہو۔

تعلیم کی تکمیل اور ٹریننگ کے بعد ہماری تقرری سیرالیون، مغربی افریقہ میں ہوئی۔ داعی الی اللہ کے طور پر وہاں خدمات بجاتے رہے تا آنکہ تین سال کا عرصہ ہونے کو آیا کہ حافظ بشیر الدین عبید اللہ صاحب مربی سلسلہ جن کے وہاں قیام کو تین سال مکمل ہو چکے تھے وہ واپس وطن روانہ ہونے کے احکامات کے انتظار میں تھے کہ ان کے بیٹے نے انگلینڈ سے رابطہ کیا کہ واپس پاکستان جاتے ہوئے انہیں لنڈن میں ملتے جائیں۔ چنانچہ مکرم حافظ صاحب نے وکالت تبشیر تحریک جدید ربوہ سے درخواست کی کہ انہیں براستہ لنڈن پاکستان آنے کی اجازت دی جائے اور کہ سفری ٹکٹ اس راستہ کا بھجوایا جائے اور اگر اس پر اخراجات زیادہ اٹھتے ہوں تو بحری سفر کا ٹکٹ بھجوایا جائے۔ جب وہ یہ درخواست مع تجویز ارسال کرنے لگے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ تمہارا عرصہ قیام بھی پورا ہونے کو ہے تم بھی اسی راستے واپسی کی اجازت لے لو تا بحری جہاز کا سفر جو کئی دنوں پر مشتمل ہو گا ہمرکاب ہونے کی وجہ سے بہتر گذرے۔ ان کی اس تجویز پر مجھے شیکسپیر کے وطن کو دیکھنے کی تمنا اور شوق یاد آ گیا۔ چنانچہ میں نے بھی دفتر تبشیر کو اسی قسم کی اجازت براستہ انگلینڈ سفر کی درخواست بھجوا دی۔ دفتر نے فراخدلی سے ہم دونوں کو اجازت مرحمت کرتے ہوئے بحری سفر کا ٹکٹ بھجوا دیا۔ اس طرح ہماری معصومانہ مگر دیرینہ خواہش مشہور ڈرامہ نگار شیکسپیر کے وطن کو دیکھنے کی پوری ہوئی اور قرآن کریم کے ارشاد ''سیروافی الارض......'' کی تعمیل کی بھی توفیق نصیب ہوئی۔ پھر اس قرآن کریم کے ارشاد پر تو ایسا عمل ہوا کہ ملکوں ملکوں داعی الی اللہ کا فریضہ ادا کرنے کے لئے جانے کے برابر اور عمر بھر توفیق نصیب ہوتی چلی گئی۔ اب اگرچہ صحت کی خرابی کی وجہ سے عملی میدان میں کام مشکل ہے اور ریٹائرڈ زندگی امریکہ میں بسر ہو رہی ہے لیکن اب بھی کبھی کبھی ''سیروافی الارض'' پر عمل ہوتا رہتا ہے۔ اپریل 2004ء کو ایک مرتبہ پھر شیکسپیر کے دیس جانے کا موقعہ ملا لیکن اس مرتبہ اس کے ڈراموں کی تحریری کشش نہیں تھی بلکہ امام جماعت احمدیہ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات مقصود تھی اور پھر انگلینڈ سے فرانس، بیلجیم، ڈنمارک، سویڈن اور جرمنی بھی ''سیروافی الارض'' میں شامل رہے۔ پھر اسی سال ستمبر 2004ء میں سعودی عرب کی سیر اور مقامات مقدسہ کی زیارت کی توفیق ملی۔

5- اطلبوا العلم ولو بالصین (حدیث):

علم کے حصول میں عمر کی کوئی قید نہیں صرف جذبہ کی ضرورت ہے۔سلسلہ کی خدمت کے لئے جس قدر تعلیم کی ضرورت تھی اس کی تکمیل 1956ء میں ہو چکی تھی۔سلسلہ کی خدمت سرانجام دیتے قریباً سات سال گذر چکے تھے جن میں سے تین سال کا عرصہ سرالیون میں گذرا تھا۔وہاں سے واپس ربوہ پہنچنے پر چار ماہ کی رخصت ملی۔اہل وعیال جو ربوہ میں ہی تھے ان کے ساتھ رشتہ داروں اور دیگر جان پہچان والوں سے ملنے ملانے میں ہی یہ عرصہ ختم ہو گیا۔

دفتر دیوان تحریک جدید میں حاضری دی اور چند ماہ متفرق قسم کے کام سپرد رہے۔کچھ عرصہ جامعہ احمدیہ کے کتب خانہ میں مہتمم کے فرائض انجام دئے۔اس زمانہ میں سید داؤد احمد صاحب جامعہ احمدیہ کے پرنسپل تھے انہوں نے کتبخانہ کے انصرام وانتظام کے ساتھ ساتھ یہ فرض بھی عائد کر دیا کہ جس روز کوئی استاد رخصت پر ہو تو مجھے ان کے خالی پیریڈ میں پڑھانا ہوگا۔اس طرح تدریس کا بھی تجربہ حاصل ہوا۔چندہ ماہ بعد مہتمم کتبخانہ کی اسامی پر مستقل تقرری ہونے پر دوبارہ دفتر دیوان میں واپسی ہوئی۔اس دوران چند دوستوں نے ایم۔اے عربی کی کلاس جو حال ہی میں تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں جاری ہوئی تھی میں داخلہ لیا۔یاد رہے کہ اس زمانہ میں پرائیویٹ طور پر امتحان کی اجازت نہیں ہوتی تھی بلکہ کالج میں داخل ہو کر باقاعدہ پڑھائی کے بعد ہی امتحان کی اجازت ملتی تھی۔داخلہ لینے والے دوستوں نے مجھے بھی داخلہ لینے کا مشورہ دیا۔اور قائل کرنے کے لئے حدیث کا حوالہ دیا کہ دور دراز کا سفر کر کے تعلیم حاصل کرنے کا حکم ہے جبکہ ہمارے لئے تو درسگاہ قریب آ گئی ہے۔مزید یہ کہ اس کلاس کی تدریس بعد دوپہر ہوتی ہے اس لئے دفتری فرائض کی ادائیگی پر بھی اثر نہیں پڑے گا اور رخصت لینے کی ضرورت نہیں۔معلومات حاصل کرنے پر پتہ چلا کہ امتحان میں شمولیت کے لئے دو سال کالج میں باقاعدہ داخلہ لے کر پڑھائی کی شرط ہے۔چونکہ یہ ممکن نہ تھا اس لئے اس مشورہ پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ایک روز ایم۔اے۔عربی کلاس کے پروفیسر صاحب سے براہِ راست ملاقات ہوئی۔ان سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ 'مولوی فاضل' کی ڈگری کے حامل نے اگر پورے مضامین کے ساتھ بی۔اے کا امتحان پاس کیا ہو تو اسے ایک سال کی رخصت ہے اور اس کے لئے ایک سال کی باقاعدہ کالج کی تدریس کافی ہے۔انہوں نے فرمایا کہ کل کالج کے دفتر میں ان سے

مل کر پوری معلومات حاصل کر لوں۔اگلے روز ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔انہوں نے قواعد ملاحظہ کر کے تصدیق کی۔یہ بھی بتایا کہ تعلیمی سال مئی سے شروع ہوتا ہے اور اب تو اکتوبر کا آخر ہے۔پھر انہوں نے خود ہی اس کا حل نکالا اور فرمایا کہ پورے سال کی کالج کی ٹیوشن فیس جمع کروانے پر امتحان میں شمولیت کے لئے داخلہ فیس بھجوانے کی رعائت مل سکتی ہے۔چنانچہ ان کے صائب مشورہ پر عمل کیا گیا۔غالباً نومبر 1964ء میں کالج میں داخلہ لیا۔اپریل یا مئی 1965ء میں ایم۔اے۔عربی کے امتحان میں شمولیت اختیار کی۔14 نومبر 1965ء کو پنجاب یونیورسٹی نے نتیجہ کا اعلان کیا۔خدا تعالیٰ کے فضل سے درجہ اول میں کامیابی نصیب ہوئی۔سید عبدالحیٔ، عطاء المجیب، عبدالہادی ناصر اور قریشی مقبول احمد وغیرہ نے بھی اسی سال ایم۔اے کیا تھا۔

'پسرِ موعود' کا انتقال پُر ملال:

8 نومبر 1965ء کو 'پسر موعود' حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانیؓ جو حضرت مسیح موعود کی پیشگوئی کے مطابق 'مصلح موعود' بھی تھے اس دار فانی سے دارالبقاء کی طرف ہم سب کو حزین و غمگین چھوڑ کر ہمیشہ ہمیش کے لئے روانہ ہوئے۔تجہیز و تکفین سے قبل نئے خلیفہ کا انتخاب ہونا تھا۔چنانچہ پرائیویٹ سیکرٹری کی طرف سے اطلاع موصول ہوئی کہ انتخاب کے لئے اپنا حق ووٹ استعمال کرنے کے لئے مسجد مبارک میں حاضر ہو جاؤں۔وقت مقررہ پر سب ممبران جنہیں قواعد کے مطابق خلافت کے انتخاب میں ووٹ دینے کا حق حاصل تھا مسجد مبارک ربوہ میں پہنچ گئے۔اسی افسردہ حالت میں جبکہ دل خدا کے خوف سے لبریز ہوتے ہیں ترساں ولرزاں حلف برداری ہوئی۔خدا تعالیٰ کے حضور دعائیں اور التجائیں کرتے ہوئے کہ اے قادر مطلق صحیح فیصلہ کی توفیق دے حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کے حق میں خلافت ثالثہ کے لئے منتخب ہونے کے لئے ووٹ ڈالا۔بعد میں رونما ہونے والے واقعات نے ثابت کیا کہ خدا تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق بخشی۔فالحمدللہ۔

سیرالیون روانگی اکتوبر1960ء

ربوہ ریلوے اسٹیشن پر ریل گاڑی کے دروازے میں کھڑے: میر غلام احمد نسیم (پھولوں کے ہار پہنے ہوئے)، دائیں: ضیاء الدین۔ بائیں: مولوی رشید احمد سرور، عقب میں: مولوی نظام الدین۔

ریلوے اسٹیشن ربوہ

دائیں سے بائیں: اسحاق خلیل، مولوی نظام الدین، حسن محمد خان عارف، میر غلام احمد نسیم، بشارت احمد بشیر، عبدالکریم طارق، قاضی مبارک احمد، مولوی عبدالرشید رازی۔

دوسری قطار میں دیگر احباب ج الوداع کرنے آئے
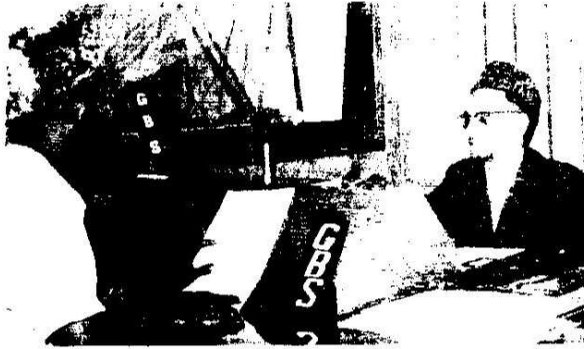
گی آنا براڈ کاسٹنگ سروس پر اسلام پر پروگرام پیش کیا جا رہا ہے۔

صد سالہ جشن تشکر کے موقع پر احمدیہ بیت الذکر کوٹلی میں لی گئی تصویر

سورینام 1968ء واپسی گی آنا روانگی کے موقعہ کی تصویر

سیرالیون: دائیں سے: پاسیدو۔ ڈاکٹر شاہنواز، علی روجرز، قریشی محمد افضل، شیخ نصیر الدین، سمیع اللہ سیال، ملک غلام نبی، مولوی محمد صدیق گورداسپوری

جماعت احمدیہ گی آنا (جنوبی امریکہ)
کے سالانہ جلسہ کے اختتام پر لی گئی تصویر

باب چهارم

گی آنا، جنوبی امریکہ

تعارف:

گی آنا جنوبی امریکہ کے شمال مشرقی ساحل پر واقعہ ہے۔ اس علاقہ کو استعماری طاقتوں نے اپنی نو آبادیاتی یلغار کے وقت تین حصوں میں تقسیم کرلیا تھا۔ اس طرح ان حصوں کے الگ الگ نام برٹش گی آنا، ڈچ گی آنا اور فرنچ گی آنا قرار پائے۔ ان میں سے برٹش گی آنا نے مئی 1966ء میں آزادی کے بعد ''گی آنا'' نام اختیار کرلیا۔ ڈچ گی آنا آزادی کے بعد سورینام کہلاتا ہے جبکہ فرنچ گی آنا اب بھی بدستور فرنچ گی آنا ہے۔

گی آنا (Guiana) جس کے معنی پانیوں کی زمین (Land of Waters) کے ہیں حقیقی معنوں میں یہی نقشہ پیش کرتا ہے۔ ہر طرف دریا ہی دریا ہیں۔ بعض دریا غیر معمولی نوعیت کے ہیں۔ بعض جگہ ان کی چوڑائی میلوں تک ممتد ہے۔ اکثر دریاؤں میں جہاز رانی ہوتی ہے۔ مواصلاتی نظام بڑی بڑی کشتیوں کا مرہون منت ہے۔ آبادی زیادہ تر ساحلی علاقوں تک محدود ہے۔ اندرونی علاقے غیر آباد اور جنگلات سے پٹے پڑے ہیں۔

آب و ہوا معتدل ہے۔ بارش کثرت سے ہوتی ہے۔ پیداوار میں گنا اور چاول مشہور ہیں پھل بھی کثرت سے ہوتے ہیں۔ سولہویں صدی سے قبل کی تاریخ پردہ اخفاء میں ہے۔ نو آباد جب وہاں پہنچے تو بغیر کسی بڑی لڑائی کے علاقہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ وہاں کے اصل باشندے نہ تو جدید فنون حرب سے واقف تھے اور نہ ہی اتنے منظّم کہ حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکیں۔ استعماری طاقتوں کو اگر کہیں لڑائی کرنی پڑی تو وہ بھی آپس میں ہی تھی یعنی ایک طاقت کسی خاص علاقے کے حصول کیلئے دوسری سے

ٹکرائی۔ وہاں کے اصل باشندوں نے جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لے لی اور اب تک دور دراز علاقوں میں ان کی بستیاں ملتی ہیں۔ وہاں کے قدیمی باشندوں کو امریکن انڈین (Amer-Indian) کہا جاتا ہے جو بہت ہی کم تعداد میں ہیں اور اب بھی نئی تہذیب سے نابلد پہاڑوں اور جنگلوں میں رہائش پذیر ہیں۔ نوآباد جب وہاں قابض ہوئے تو ان کو زرخیز زمینوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے مزدوروں کی ضرورت پیش آئی۔ انہوں نے غلاموں کو خریدنا شروع کیا لیکن جلد ہی غلامی غیر قانونی قرار پائی گئی۔ غلامی ختم ہونے پر ہندوستان، انڈونیشیا، چین اور پرتگال سے ایسے لوگ لے گئے جو گنے کے کھیتوں میں کام کرسکیں۔ اس طرح وہاں کی آبادی چوں چوں کا مربہ بن گئی۔ گی آنا کی آبادی کم وبیش نصف ہندوستانی باشندوں، کوئی چالیس فیصد افریقن اور باقی چینی، پرتگالی اور دیگر یورپ کے باشندوں پر مشتمل ہے۔ کم وبیش یہی حال سورینام اور فرانسیسی گی آنا کا ہے۔

جزائر غرب الہند اور گی آنا:

گی آنا کی آبادی، تمدن اور مذہبی حالات کو جزائر غرب الہند (West Indies) سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ وہاں تک رسائی کا ذریعہ یہی جزائر رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس علاقہ کا مربوط تعلق ان جزائر سے قائم ہے۔ گی آنا میں اسلام کی داستان بھی ان جزائر سے الگ ہو کر بیان نہیں کی جاسکتی۔

جزائر غرب الہند ان چھوٹے چھوٹے بحر اوقیانوس کے جزیروں کا نام ہے جو کولمبس نے دریافت کئے تھے۔ کولمبس سپین سے مغرب کی طرف روانہ ہوا تا کہ وہ مغرب کی طرف سے ہندوستان (East Indies) پہنچے۔ جب ان جزائر میں پہنچا تو اس نے خیال کیا کہ وہ ہندوستان کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اور یہ جزائر یورپ کو مغرب کی طرف سے ہندوستان سے ملاتے ہیں۔ چنانچہ اس وجہ سے اس نے ان جزائر کو West Indies کا نام دے دیا۔

17 ویں صدی سے ان جزائر کی تاریخ نمایاں ہوتی ہے جبکہ برطانیہ اور فرانس نے شکر کی تلاش میں ان جزیروں کو موزوں ترین پایا۔ غلامی کی داستان بھی اسی سے وابستہ ہے۔ کیونکہ گنے کی کاشت اور قطع برید کے لئے مضبوط لوگ درکار تھے۔ یورپ کے لوگ اس کام کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ پلانٹرز کی توجہ افریقہ کے سیاہ فام باشندوں کی طرف مبذول ہوئی۔ پرتگالی اس سے قبل ہی

مغربی افریقہ سے غلاموں کی تجارت کر رہے تھے۔

صحیح زمانہ اور وقت کا تعین قریباً ناممکن ہے کہ افریقہ کے باشندے کب ''نئی دنیا'' میں پہنچے۔ ہو سکتا ہے کہ کولمبس کے پہلے سفر میں کوئی نہ کوئی موجود ہو۔ پھر سپین کی حکومت نے باقاعدہ اجازت نامے جاری کئے کہ افریقنوں کو غلاموں کے طور پر جزائر غرب الہند میں لایا جائے بشرطیکہ وہ عیسائی ہوں۔ اس تجارت کا کھلنا تھا کہ ایک اندازے کے مطابق کوئی دو کروڑ لوگ نئی دنیا میں پہنچادئے گئے۔

جان ہاکن (John Hawkin) ایک انگریز کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے مغربی افریقہ کے پرتگالی علاقہ سے غلامی کی تجارت کا آغاز کیا۔ 1562ء میں اس نے لنڈن کے بعض تاجروں کو اپنا ہمدرد بنالیا اور اس طرح غلاموں کی تجارت کی اجازت حاصل کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس 300 افریقن غلام تھے۔ جوں ہی غلاموں کی تجارت قانونی طور پر جائز قرار پائی۔ کئی تاجر اس میدان میں اتر آئے۔ افریقہ کے قبائلی سرداروں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہزاروں انسانوں کو تاجروں کے ہاتھوں فروخت کرنا شروع کر دیا۔ جنگی قیدیوں کو غلام بنا کر بیچ دیا جاتا۔ جوں جوں غلاموں کی قیمت بڑھتی گئی جنگ کی یہ صورت ہوگئی کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ پر چھوٹا موٹا حملہ کرتا اور کچھ لوگوں کو پکڑ کر یورپ کے تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیتا۔ نوبت یہانتک پہنچی کہ بعد میں سردار اپنے ہی قبیلہ کے آدمی تاجروں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے۔

چونکہ غلام جنگی قیدی ہوتے تھے اور بعض دفعہ کسی قبیلہ کے سردار یا اس کے رشتہ دار بھی غلام بننے پر مجبور کر دئے جاتے تھے لہٰذا جب وہ اکٹھے ہوتے تو ان میں سے کوئی نہ کوئی ایسا آدمی نکل آتا جو ان کو منظم کر سکے۔ چنانچہ 17 ویں صدی میں بہت سی جگہ ان غلاموں نے بغاوتیں بھی کیں۔ بغاوتوں سے بچنے کے لئے مالک ان کو ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرنے سے روکتے۔ حتی کہ بعض اوقات مذہبی رسول ادا کرنے سے بھی روک دیا جاتا۔ قانونی شادی بھی نہ کرنے دی جاتی اور ان کے بچوں کو دوسری جگہ بیچ دیا جاتا۔ باغی کو میخوں سے لکڑی کے تختہ پر پیوست کر کے جلا دیا جاتا۔ زمانہ گذرنے کے ساتھ بعض اصلاحات بھی ہوئیں اور اس طرح ایک نئی نسل نے جنم لیا۔ غلاموں کو مجبوراً وہ زبان سیکھنی پڑتی جو ان کے مالک بولتے اور چونکہ مالک زیادہ عیسائی ہوتے اس لئے وہ اپنے مالک کا مذہب بھی اختیار کر لیتے۔

جزائر غرب الہند اور گی آنا میں اسلام:

اسلام ان جزائر اور جنوبی امریکہ خصوصاً جنوبی امریکہ کے شمال مشرقی ساحل کے علاقوں میں کیسے پہنچا۔اس سلسلہ میں ابھی تک پوری تحقیق ہونا باقی ہے۔اس موضوع پر جو کام ہوا ہے وہ ابھی تک تشنہ تکمیل ہے۔ یہ خیال عام ہے اور درست بھی معلوم ہوتا ہے کہ نائیجیریا، مغربی افریقہ سے جب غلام دنیا کے اس حصہ میں منتقل کیئے گئے تو ان میں سے کئی مسلمان تھے۔ غلاموں کو مذہبی رسول ادا کرنے کی آزادی نہ تھی۔ کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے والوں پر یہ پابندی تھی کہ وہ عیسائی مذہب کے مطابق عبادات بجا لائیں۔لیکن پھر بھی بعض ہمت والے لوگوں نے اس ناروا پابندی سے نفرت کی۔ چنانچہ گی آنا میں قیام کے دوران مجھے ایسی روایات سننے کا اتفاق ہوا کہ مغربی افریقہ سے آنے والے بعض افریقن چھپ چھپا کر نماز ادا کیا کرتے تھے اور جب مالکوں کو علم ہوتا تو وہ ان پر سختی کرتے اور انہیں عیسائی مذہب کے مطابق عبادت کرنے پر مجبور کرتے۔

اس بات کو کہ اسلام جزائر غرب الہند اور قریب کے جنوبی امریکہ کے علاقوں میں غلاموں کے ذریعہ پہنچا اس حقیقت سے تقویت ملتی ہے کہ ان علاقوں میں اب تک ''مسلمان'' کو ''فولا مین'' (Fula man) کہا جاتا ہے۔سیرالیون، مغربی افریقہ، میں قیام کے دوران میں اس لفظ سے مانوس تھا۔مغربی افریقہ کے ساحلہ علاقوں میں ''فولا'' کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ وہ عربوں کی بلا واسطہ اولاد ہیں اور ان کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کے ذریعہ ان علاقوں میں اسلام پہنچا۔ چونکہ یہ قبیلہ مسلمان ہے اس لئے ہر مسلمان کو عام لوگ اس نام سے پکارتے ہیں۔ان کے نزدیک مسلمان اور ''فولا مین'' ایک ہی معنی کے دو لفظ ہیں۔ چنانچہ Guianas میں سابق برٹش گی آنا، ڈچ گی آنا اور فرنچ گی آنا میں مسلمانوں کو اس نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

غلامی کے اختتام کے ساتھ ساتھ مذہبی رسوم کی ادائیگی میں لگائی گئی پابندیاں بھی ڈھیلی پڑ گئیں۔ لہذا جو لوگ دل سے مسلمان تھے اور کسی نہ کسی طرح اپنے مذہب پر قائم تھے وہ برملا اپنے آپ کو مسلمان کہلانے لگے۔

انڈونیشیا اور ہندوستان سے مسلمانوں کی آمد:

غلامی کو غیر قانونی قرار دیئے جانے پر پلانٹرز (Planters) کو اپنے کھیتوں پر کام کرنے والوں کی کمی محسوس ہوئی۔ کیونکہ وہ اب افریقنوں سے اس طرح کام نہیں لے سکتے تھے جس طرح وہ غلامی کے دور میں ان سے کام لیتے رہے تھے۔اس صورت حال نے ان کو نئی راہیں تلاش کرنے پر مجبور کر دیا۔سب سے پہلے پرتگال سے کچھ لوگ لائے گئے۔ مگر آب و ہوا ان کو موافق نہ آئی اور وہ زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوئے۔ پھر چین سے کچھ لوگ لائے گئے مگر وہ بھی زیادہ کارآمد ثابت نہ ہوئے۔ بالآخر ان کی نظریں ہندوستان اور انڈونیشیا کی طرف اٹھیں۔ ’گی آنا‘ (Guiana) اور انڈونیشیا کی آب وہوا اور اسی طرح ’گی آنا‘ اور ہندوستان خصوصاً جنوبی ہندوستان کی آب وہوا میں مماثلت تھی۔اس لئے ان دونوں ملکوں سے لوگوں کو ایک معین مدت تک کے لئے وہاں لے جانے کا پروگرام مرتب ہوا۔ چنانچہ ان ممالک سے لوگ وہاں پانچ سال کے لئے جائے جاتے جن کو Indenture کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں وہاں لے جائے جانے لگے اور قریباً انیسویں صدی کی پہلی چوتھائی تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایسے لوگ جن کے خاندانی روابط اپنے ملک میں مضبوط تھے وہ تو واپس اپنے اپنے وطن چلے گئے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے وہیں رہنا پسند کیا اور وہ مستقل طور پر وہیں آباد ہو گئے۔

چونکہ نو آبادیاتی نظام ترقی کے مراحل طے کرنے کے بعد روبہ تنزل تھا اس لئے بھرتی ہونے والو کے لئے مذہبی امتیاز جو پہلے شرط کے طور پر موجود تھا منسوخ کر دیا گیا۔اس طرح ہندوستان اور انڈونیشیا کے مسلمان بھی ان علاقوں میں پہنچ گئے۔

سورینام:

چونکہ ڈچ کالونی تھی اور ادھر ان دنوں انڈونیشیا بھی ہالینڈ کے زیر اقتدار تھا۔اس لئے انڈونیشیا سے کھیتوں پر کام کرنے والے لوگ وہاں لائے گئے۔ یہ لوگ زیادہ تر مسلمان تھے۔سورینام پہنچ کر انہوں نے مساجد تعمیر کیں جن کا رخ بدستور مغرب کی طرف رکھا گیا۔انڈونیشیا سے قبلہ بطرف مغرب ہے اور وہاں مساجد کا رخ مغرب کی جانب ہوتا ہے مگر یہ لوگ مکہ شریف سے مغرب کی جانب بہت دور نکل

گئے تھے جہاں سے قبلہ مشرق کی طرف ہے اور محرابوں کا رخ بھی مشرق کی طرف ہونا چاہئے لیکن ان لوگوں نے یہی تصور کیا کہ یہاں سے بھی قبلہ مغرب کی طرف ہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی مساجد کے محراب مغرب کی طرف ہی رکھے۔ حتیٰ کہ اب بھی (1967) وہاں بعض مساجد ایسی ہیں جن کے محراب مغرب کی طرف ہیں۔ اب بعض جماعتوں نے اپنی مساجد کے محراب مشرق کی طرف بنانے شروع کئے ہیں۔

مگر اس کی وجہ سے ان میں اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ بعض امام اس بات پر مصر ہیں کہ محراب مغرب کی طرف ہی ہونے چاہئیں۔ اس لئے اب سورینام میں انڈونیشین مسلمانوں کے دو گروہ ہو گئے ہیں۔ اس کے برعکس جو مسلمان برصغیر سے وہاں پہنچے انہوں نے اپنی مساجد کے محراب مشرق کی طرف ہی رکھے۔ کیونکہ وہ ان لوگوں کے بعد ایسے زمانہ میں وہاں پہنچے جبکہ قبلہ کے رخ کے تعین کا طریق واضح ہو چکا تھا۔

2- گی آنا میں احمدیت کا پیغام اور احمدیہ مشن کا قیام:

گی آنا میں احمدیت کا تعارف کب اور کیسے ہوا؟ اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں ٹرینیڈاڈ، ڈچ گی آنا (سورینام) اور برٹش گی آنا (گی آنا) تینوں کو یکجا کرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے ان علاقوں میں احمدیت کا تعارف بذریعہ لٹریچر ہوا۔ لیکن کب ہوا اس سلسلہ میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جن ابتدائی احمدیوں سے مجھے وہاں قیام کے دوران 1966ء تا 1970ء ملنے کا اتفاق ہوا ان کی روایات میں بھی اختلاف پایا جاتا تھا۔ عام خیال یہ ہے کہ 1925ء اور 1930ء کے درمیان احمدیہ جماعت کی طرف سے شائع شدہ قرآن مجید کے تراجم اور انگریزی میں تحریر شدہ کتب کسی نہ کسی ذریعہ سے ٹرینیڈاڈ پہنچیں اور وہاں چند احباب احمدیت کی تعلیمات سے متاثر ہوئے۔ پھر ڈچ گی آنا (سورینام) میں کتب پہنچیں اور وہاں احمدیت متعارف ہوئی اور چند احباب نے احمدی تعلیمات کا اثر قبول کیا۔ بعد ازاں وہاں سے برٹش گی آنا (گی آنا) میں احمدیت کی تعلیم پہنچی اور وہاں کی چند پیاسی روحوں نے احمدیت کو دل سے قبول کیا۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام بانی سلسلہ احمدیہ کو الہاماً بتایا گیا تھا کہ "میں تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا" اس پیشگوئی کے مطابق ہی گی آنا میں بھی احمدیت کے پیغام کا آغاز معجزانہ طور پر ہوا۔ اور وہ اس طرح کہ 1956ء کی بات ہے جبکہ گی آنا جو اس وقت برطانیہ کی ایک کالونی تھا اور برٹش گی آنا کہلاتا تھا کے ایک نوجوان یوسف خان جسکی عمر بمشکل 18/ 19 سال کی ہو گی گھومتے پھرتے ایک

کتابوں کی دکان میں جا نکلا۔ وہاں پر اسے ایک کتاب نظر آئی۔ کچھ دیر کتاب کی ورق گردانی کی اور پھر کتاب خرید لی۔ اس کے مطالعہ سے وہ احمدیت سے روشناس ہوا۔ مزید تحقیق اور معلومات کے حصول کی جستجو ہوئی تو مزید کتب حاصل کیں اور پھر اپنے ملنے والوں سے ذکر کیا تو جیسا کہ دنیا کا قاعدہ ہے اسے بھی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس نے تحقیق جاری رکھی۔ جماعت کے مرکز ربوہ سے مزید کتب و رسائل حاصل کئے اور مطالعہ و تحقیق جاری رکھی۔ جماعت کے قائم کردہ مشنوں سے رابطہ کیا جن مشنوں سے اس نے حق کی تلاش کے لئے تن تنہا رابطے کئے ان میں غانا، نائیجیریا اور امریکہ کے مشن شامل تھے۔ مرکز ربوہ سے رابطہ کرنے پر اسے یہ بھی ہدایت ملی کہ وہ سورینام اور ٹرینیڈاڈ میں قائم مشنوں سے رابطہ قائم کرے۔ چنانچہ اس نے ان مشنوں سے رابطہ کیا۔

اس نوجوان کو سرسری طور پر یہ تو علم تھا کہ جماعت احمدیہ کے دو گروہ ہیں ان میں سے ایک انجمن اشاعت اسلام جو عرف عام میں لاہور جماعت کے نام سے مشہور ہے اور جس کے پیروکار چند افراد گی آنا میں موجود تھے لیکن جماعت کے دوسرے گروہ یا یوں کہیں کہ بڑے حصے کے بارے میں اسے زیادہ معلومات حاصل نہ تھیں۔ مرکز ربوہ سے لٹریچر ملنے اور اس کے بغور مطالعے سے دونوں گروہوں کے باہم اختلافات کا علم ہوا۔ انجمن اشاعت اسلام لاہور کے ممبر جنہیں گی آنا میں لاہوری احمدیوں کے نام سے شہرت حاصل ہے کے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دعاوی اور خلافت احمدیہ کے بارے میں عقائد کا علم ہوا۔ دونوں گروہوں کے عقائد کے تقابلی مطالعہ سے خلافت سے وابستہ احمدیوں کے دلائل صحیح معلوم ہوئے اور یہ ناقابل تردید حقیقت کہ اسلام کی اشاعت اور اسے تمام ادیان پر غالب کرنے کے لئے ایک زبردست تنظیم کی ضرورت ہے اور یہ تنظیم خلافت کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ خلافت کے بغیر کسی صحیح اور مبنی برحق تنظیم اور نظام کو چلانا ممکن ہی نہیں۔ قرآن مجید کی آیت استخلاف سے مسلمانوں میں خلافت کا قائم ہونا اور پھر اس کا ہمیشہ قائم رہنا ثابت ہے۔ ان تمام دلائل اور ان کی حقانیت کے باوجود ابھی تک خلافت کی بیعت کے لئے شرح صدر نہ تھا۔ حضرت مسیح موعودؑ کے ارشاد کہ جب شرح صدر نہ ہو تو حق کا متلاشی خدا تعالیٰ سے دعا کرے اور اسے اس دعا کے نتیجہ میں چالیس یوم کے اندر اندر صحیح راستہ کا علم دیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ عرصہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ آیت قرآنی " وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ "(2:42) اس کی راہنما ثابت ہوئی اور اس کا دل حق کے قبول کرنے کے لئے تیار ہو

گیا۔ وہ اس وقت سسٹرز ویلج ایسٹ بینک بربیس (Sisters Vilage, East Bank Berbice) کی مسجد میں دعا میں مشغول تھا اور یہ عصر کا وقت تھا۔ اس تفہیم پر اس نے اسی وقت اسی مسجد میں بیعت کا فارم پُر کیا اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں ربوہ بھیج دیا۔ ساتھ ہی داعی الی اللہ کا کام مقدور بھر شروع کر دیا اس کی کوششوں سے چند مزید افراد خلافت احمدیہ کی بیعت کر کے جماعت میں شامل ہو گئے اور اس طرح گی آنا میں ایک منظّم جماعت قائم ہوگئی۔ اس نوجوان کا نام یوسف خان (موکن) تھا۔

اس تنظیم میں ابتداء ہی میں شامل ہونے والوں میں قابل ذکر محمد شریف بخش تھے۔ ہماری جماعت میں شامل ہونے سے قبل وہ لاہوری جماعت کے سرگرم اور پر جوش مبلغ تھے لیکن خدا تعالیٰ نے ان کا دل سچائی کو ماننے کے لئے کھول دیا اور وہ خلافت کی بیعت کر کے جماعت میں شامل ہو گئے۔ ان کے شامل ہونے سے ہماری نئی تنظیم کو بہت تقویت ملی اور ہم اس قابل ہو گئے کہ احمدیت یعنی حقیقی اسلام کی کھل کر تبلیغ کریں۔

1959ء کے شروع میں مولوی بشیر احمد آرچرڈ صاحب مربی سلسلہ ٹرینیڈاڈ نے گی آنا کا تبلیغی دورہ کیا جو بہت کامیاب رہا۔ انہوں نے بہت سے غیر از جماعت اجتماعات سے خطاب کیا۔ احمدیہ تحریک کے قیام کے اغراض و مقاصد بیان کئے انہیں کہیں تو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور کہیں خوش آمدید کہا گیا۔ مجموعی طور پر ان کا یہ دورہ کامیاب رہا اور بہت سی سعید روحوں نے احمدیت یعنی حقیقی اسلام میں شمولیت کرنے کی سعادت حاصل کی اور اس دورے کے نتیجہ میں گی آنا میں جماعت کی روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ ان کے اس دورے کے دوران جس قابل ذکر شخصیت نے جماعت میں شمولیت اختیار کی وہ مولوی ابراہیم خان امام مسجد سسٹرز ویلج تھے جنہوں نے بعد میں اپنی خداداد قابلیت اور جانفشانی سے مسجد مذکورہ کے تمام ممبروں کو احمدیت میں شمولیت کے لئے قائل کیا اور ان کے ذاتی نمونہ سے اور تبلیغ سے کچھ عرصہ بعد سب ممبر جماعت میں شامل ہو گئے اور اس طرح یہ مسجد ملک کی پہلی مسجد احمدیہ کہلائی۔ مولوی صاحب مذکور گی آنا کا دورہ مکمل کر کے واپس ٹرینیڈاڈ چلے گئے۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد مرکز سلسلہ نے مولوی بشیر احمد آرچرڈ صاحب کو ہی گی آنا کا مربی مقرر کیا اور وہ 1960ء کے وسط میں گی آنا پہنچے اور باقاعدہ طور پر ''احمدیہ مسلم مشن آف گی آنا'' کا قیام عمل میں آیا جو خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے برابر دن دگنی اور رات چگنی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ مولوی بشیر احمد آرچرڈ صاحب کا گی آنا میں قیام قریباً چھ سال رہا اور جماعت کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ اسلام کی اشاعت اور

عوام تک اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے ریڈیو سٹیشن سے پروگرام نشر کرتے رہے۔ یہ مذہبی پروگرام ہوتا اور اسے نشر کرنے کے لئے یہ شرط تھی کہ اپنے مذہب اور مسلک کی تعلیم اور اس کی خوبیاں بیان کی جائیں کسی دوسرے مذہب یا فرقہ کی تعلیمات پر تنقید نہ کی جائے اور یہ کہ نشر ہونے والے پروگرام کی ایک نقل کم از کم ایک ہفتہ قبل ریڈیوں کی انتظامیہ کو مہیا کی جائے وغیرہ۔

3- گی آنا کے لئے بطور مربی تقرر اور روانگی

سیرالیون، مغربی افریقہ میں تین سال تعلیمی و تبلیغی کام کرنے کے بعد دسمبر 1963ء کو واپس ربوہ پہنچا۔ ربوہ قیام کے دوران مرکزی دفاتر میں فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ ایم اے عربی کے امتحان میں شمولیت کی تیاری بھی جاری رہی اور خدا تعالیٰ کے فضل سے ایم اے کا امتحان اچھی پوزیشن میں پاس کیا۔ 1965ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی وفات حسرت آیات ہوئی۔ اور حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کا بطور خلیفۃ المسیح الثالث کے انتخاب ہوا۔ قواعد انتخاب کے مطابق ووٹر ہونے کی حیثیت سے اس با برکت انتخاب میں حصہ لینے کا شرف حاصل ہوا۔ فالحمد للہ۔ خلافت ثالثہ کے قیام کے چند ماہ بعد وکالت تبشیر تحریک جدید کی طرف سے اطلاع موصول ہوئی کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ نے گی آنا، جنوبی امریکہ بطور مربی سلسلہ تقرر فرمایا ہے۔ چنانچہ اس تقرری کے نتیجہ میں 25 مئی 1966ء کو گی آنا کے لئے روانہ ہوا۔ روانگی سے کچھ روز قبل حضور ایدہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضور نے ضروری ہدایات سے نوازا اور قیمتی نصائح فرمائیں۔ ملاقات کے دوران میں نے اپنے رشتہ داروں کے بارے میں جو 1965ء کی پاکستان و بھارت کی جنگ کے دوران مقبوضہ کشمیر سے ہجرت کر کے کوٹلی آزاد کشمیر میں کسمپرسی کی حالت میں قیام پذیر تھے، عرض کیا کہ ان کی وہاں قیام کی حالت بہت خراب ہے اور وہ وہاں سے نقل مکانی کر کے پاکستان کے کسی علاقہ میں جانا چاہتے ہیں اور حضور سے راہنمائی کے متمنی ہیں۔ حضور نے فرمایا کہ ان کے مفاد میں یہی ہے کہ وہ حکومت کے جس انتظام کے تحت ہیں اس کے مطابق وہاں ہی قیام پذیر رہیں اور حکومت کے مزید کسی فیصلہ کا انتظار کریں۔ ربوہ سے روانہ ہونے سے قبل میں نے حضور ایدہ اللہ کے ارشاد کی اطلاع انہیں بھجوا دی۔ چنانچہ انہوں نے اس ارشاد کی روشنی میں وہیں تنگی و ترشی، عسر و یسر میں قیام کئے رکھا۔ تا آنکہ حکومت پاکستان نے ان کی آبادکاری کا منصوبہ بنایا اور ان میں سے بعض کو ضلع جھنگ میں کچھ

زمینیں بھی الاٹ ہوئیں۔ اگر وہ خود جیسا کہ سوچ رہے تھے ادھر ادھر چلے جاتے تو انہیں آباد کاری کی یہ سہولت نہ ملتی اور زرعی زمینوں کے حصول سے محروم ہو جاتے۔ حضور کے ارشاد میں یہی حکمت تھی۔

سفر گی آنا کے لئے ہوائی جہاز کی سیٹ براستہ لندن بک ہوئی۔ ربوہ سے بذریعہ مسافر بس لاہور لاہور سے بذریعہ ہوائی جہاز کراچی اور وہاں سے لنڈن کے لئے سیٹ بک تھی۔

لمحاتِ وداع:

ان دنوں ربوہ میں بسوں کا کوئی باقاعدہ سٹاپ نہیں تھا۔ ربوہ سے گذرنے والی بسیں مسجد مبارک کے سامنے سے گذرنے والی سڑک پر مسافروں کو بسوں میں سوار کرنے یا اتارنے کے لئے رکا کرتیں تھیں۔ ربوہ سے لاہور روانگی کا وقت قبل از دوپہر مقرر تھا۔ رشتہ دار، دوست واحباب بس سٹاپ پر وداع کہنے آئے۔ میرا بیٹا میر شریف احمد عرف بوبی جس کی عمر ایک سال 9 ماہ تھی اپنی دادی اماں کے کندھے سے چمٹا ہوا تھا۔ جب میں نے اسے وداع کہنے کے لئے اپنی طرف متوجہ کیا تو میری طرف دیکھ کر پھر دادی اماں کے کندھے سے چمٹ گیا۔ اس کی دادی بھی اس سے بہت پیار کرتی تھیں۔ بس روانہ ہوئی تو اس کا یہ انداز جس سے اس نے مجھے وداع کیا راستہ بھر لاہور پہنچنے تک بار بار یاد آتا رہا۔ اور اس کے لئے برابر دعا کرتا رہا۔ کبھی خیال آتا کہ تین چار سال بعد جب واپسی ہوگی تو یہ بچہ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا ہوگا جس میں بچپن والا لگاؤ نہیں ہوسکتا۔ اس خیال اور اس جیسے اور خیالات نے برابر گھیرے رکھا۔ چھوٹے سے بیٹے سے ایک لمبے عرصہ کے لئے جدائی اور ان لمحات وداع کا اندازہ اسی کو ہوسکتا ہے جو ایسے حالات سے گذرا ہو۔

دوسرا وداع کا جذباتی لمحہ اس وقت پیش آیا جب لاہور کے ہوائی مستقر پر گیٹ سے عمارت کے اندر اس حصہ میں داخل ہوئے جہاں (وزیٹر۔ الوداع کے لئے آنے والوں) کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے ابھی میں نے چند قدم اٹھائے تھے کہ بیٹی عزیزہ امۃ الشکور جس کی عمر چھ سال چھ ماہ تھی اور جو اپنی والدہ کے ہمراہ تھی اور ابھی ابھی مجھے خوشی خوشی وداع کہہ چکی تھی نے با آواز بلند ''ابا جان'' پکارا۔ مَیں فوراً پلٹا کہ نہ جانے کیا ہوا جب قریب پہنچا تو فوراً ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ پوچھا کیا بات ہے؟ تو صرف اتنا کہا'' کچھ نہیں آپ جائیں'' اس کے بولنے کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ناراضگی کے عالم میں گویا یہ کہہ رہی ہے کہ آپ ہمیں اس طرح چھوڑ کر ہفتوں نہیں مہینوں نہیں بلکہ کئی سال کے لئے جا رہے ہیں گویا آپ کو وہ لگاؤ اور

پیار و محبت نہیں ہے جو والد کو اپنے بچوں سے ہوتا ہے۔ ورنہ ہمیں اس طرح نہ چھوڑ کر جاتے بلکہ ساتھ لے جاتے اور اگر ایسا ہی ہے تو پھر جائیے۔

معصوم بچی کی یہ ادا اور حرکت میرے لئے وداع کے لمحات میں سے ایک بہت ہی گراں لمحہ بن گئی کراچی تک پرواز کے دوران اس بچی کا یہ معصوم سا فقرہ معصوم سے لبوں سے ادا شدہ بار بار کانوں میں گونجتا رہا۔ اور اگر پیش نظر وہ اہم مقصد جس کی غرض سے جماعت بھجوا رہی تھی نہ ہوتا تو شائد قدم لڑکھڑا ہی جاتے۔ لیکن مقصد کی اہمیت اور اس کی خاطر قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی قربانیاں جب سامنے آئیں تو یہ جذباتی لمحات اور بچوں سے لمبے عرصہ کے لئے جدائی اور دوری معمولی نظر آنے لگی۔

لنڈن سے گی آنا پہنچنے کے لئے جس ہوائی جہاز پر سیٹ بک تھی اس نے میرے لنڈن پہنچنے کے تین چار روز بعد روانہ ہونا تھا۔ لہٰذا مجھے احمدیہ مشن ہاؤس میں قیام کرنا پڑا۔ وہاں قیام کا یہ فائدہ ہوا کہ حضرت چودھری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب سے ملاقات کا موقعہ ملا۔ چودھری صاحب ان دنوں اقوام متحدہ کی عدالتِ انصاف کے جج تھے۔ اس عدالت کے اجلاس ہیگ، ہالینڈ میں ہوتے تھے۔ ان کا قیام لنڈن میں تھا۔ جب اجلاس ہوتا تو اس میں شمولیت کے لئے ہیگ چلے جاتے۔ چودھری صاحب سے ملاقات ان کی قیام گاہ میں ناشتہ کی میز پر ہوئی۔ ملاقات کے دوران میں نے عرض کی کہ میں گی آنا بطور مربی سلسلہ جارہا ہوں۔ انہوں نے دوران گفتگو ذکر کیا کہ وہ اقوام متحدہ کے کسی مشن کے سلسلہ میں ٹرینیڈاڈ گئے تھے جو گی آنا کے ساحل کے قریب ایک جزیرہ ہے اور کہ ٹرینیڈاڈ اور گی آنا کے کلچر ملتے جلتے ہیں ان میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ گو یہ ایک مختصر ملاقات تھی لیکن چودھری صاحب نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود شرف ملاقات بخشا اور یہ میری خوش نصیبی تھی۔ اس سے قبل بھی کئی مرتبہ ملاقات ہوئی لیکن صرف مصافحہ تک محدود ہوتی تھی۔

مَیں 5 جون 1966ء بذریعہ برٹش ایئر ویز گی آنا پہنچا تو ہوائی مستقر (Airport) پر مجھے خوش آمدید کہنے کے لئے مولوی بشیر احمد آرچرڈ صاحب انچارج مشن گی آنا، مکرم یوسف خان صاحب اور مکرم شہباز صاحب موجود تھے۔ ہوائی مستقر سے جارج ٹاؤن گی آنا کے دارالحکومت پہنچے۔ تھوڑی دیر وہاں قیام کے بعد نیو ایمسٹرڈیم (New Amsterdam) جہاں اس وقت گی آنا مشن کا مرکز تھا روانہ ہوئے۔

8 جون 1966ء کو مشن کے دفتر میں مشن کے قرب وجوار کے احمدی احباب نے تعارف کے لئے اجلاس منعقد کیا۔ اس اجلاس میں مربی انچارج کے علاوہ مکرم شیر محمد ابراہیم خان صاحب عرف موکن سسٹر زویلج

(sisters village) جماعت کے صدراورامام،مکرم محمد شریف بخش صاحب مقامی صدر جماعتہائے لی آنا،مکرم بابا خان صاحب اور دیگراحباب جماعت شریک ہوئے۔مربی انچارج صاحب نے اپنے قیام لی آنا کا ذکر کرنے کے بعد تعارفی کلمات پر اپنی تقریر ختم کی۔ بعدازاں شیر محمد ابراہیم خان اور محمد شریف بخش نے بھی اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔اس اجلاس میں کچھ زیر تبلیغ دوست بھی شامل تھے۔اجلاس کے اختتام پر ان میں سے دوافریقن (مگرگی آنا کے باشندے)دوستوں نے جماعت میں شمولیت کا باقاعدہ اعلان کیا۔ان میں سے ایک کا نام شہباز تھا جس نے گی آنا میں مسلم برادر ہڈ آف گی آنا (Muslim Brotherhood)کے نام سے ایک فعّال تنظیم قائم کی ہوئی تھی اور وہ خود اس تنظیم کا رہنما تھا۔

29 جون 1966ء کومکرم مولوی بشیر احمد آرچرڈ صاحب انگلینڈ کے لئے روانہ ہوئے اور خاکسار نے مشن کا چارج سنبھالا۔اس وقت مشن کرایہ کے مکان میں واقعہ 22 ایسائیلم سٹریٹ(22 Asylum) نیوایمسٹرڈم بربیس میں قائم تھا۔ نیوایمسٹرڈم قصبہ سے کچھ دور سٹر نامی گاؤں میں جماعت قائم تھی۔اس جماعت کی اپنی مسجد تھی۔ یہاں جمعہ کی نماز میں اکثر مربی انچارج شامل ہوتے اور جمعہ کی نماز پڑھاتے۔ علاوہ ازیں دیگر اہم مذہبی اور جماعتی تقاریب بھی یہیں منعقد ہوتی تھیں۔اس مسجد کے علاوہ اس وقت جماعت کا اور کوئی قابل ذکر سنٹر موجود نہ تھا۔

جماعت احمدیہ گی آنا کا پہلا سالانہ اجتماع:

29 جنوری 1967ء کو جماعتہائے گی آنا کا پہلا جلسہ سالانہ منعقد ہوا۔گی آنا کی جماعتوں اور ملکی حالات کے پیش نظر یہ جلسہ یک روزہ ہی منعقد کیا گیا۔تاہم یہ ایک اچھا آغاز تھا۔اس جلسہ میں مختلف موضوعات پر تقاریر ہوئیں اس جلسہ میں غیر مسلم بھی شامل تھے اسلام کے تعارف کے ساتھ اسلامی تعلیم کی خوبیاں بیان کی گئیں۔ملک کے حالات کے مطابق اسلام کی معاشرتی تعلیم اور اس کی خوبیاں خاص طور پر اجاگر کی گئیں۔جماعت کے تعارف اور اس کی اسلامی خدمات کا بھی تذکرہ ہوا۔اس جلسہ میں ایک غیر مسلم نے بھی اسلام کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اس جلسہ میں یہ بھی طے ہوا کہ آئندہ ہر سال جلسہ ہوا کرے اور یہ کہ حالات کے مطابق سالانہ جلسہ ملک کے مختلف مقامات پر منعقد کیا جایا کرے اور میزبانی کے فرائض اس علاقہ کے احمدیوں کی ذمہ

داری ہو۔اس لئے یہ پہلا جلسہ سالانہ اسی شہر میں منعقد ہوا اور نیوایمسٹرڈم اور مضافات کی جماعتیں شریک ہوئیں اور میزبانی کے فرائض بھی انہوں نے ہی سرانجام دئے۔

عیدالفطر کا پیغام مسلمانانِ گی آنا کے نام:۔

جنوری 1967ء میں عید الفطر کے مبارک تہوار کی مناسبت سے مقامی اخبار بربیس ٹائم (Berbice Time) نے ہماری طرف سے تمام مسلمانوں کے لئے مبارکبادی کا پیغام شائع کیا۔اس پیغام میں لفظ 'عید' کے معانی بیان کرتے ہوئے رمضان شریف کی عبادات اوران کے ذریعہ حاصل شدہ مفادات کو آنے والے پورے سال بلکہ ساری عمر میں عمل کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔

GREETINGS AT 'EID'

Ghulam Ahmad Naseem M.A

The festival of Eid-ul-Fitr which makes the end of the holy month of Ramadwan is the happiest day on the Muslim Calander.

The root world of EID is aud which means to return again and again. When Muslims after observing fasts of a full month celebrate Eid and greet each other wiht happy Eid they really with them many happy Eid's return just like this.

The Eid festivles is celebrated with a view to demonstrate happiness after performance of religious duties like fasting.

Since time immenmorial God has prescribed fasting in one form or another as a means of conquering the passions of the fleash bringing one nearer to God and acquiring a greater degree of spiritual purification.

Those who have been fasting in earnest during the past month and spending more time in prayer, reading the Holy Quran, meditation, good and charitable work cannot help but feel the joy of spirital eletion of this happy day.

Let us not lose what we have gained during the past month of fasting and devotions. Although we are only called upon to fast during one month of the year let us carry that extra light which we have acquired at all times throughout the coming year.

I wish all of you a very happy Eid and rejoice with you at this happy time.

گورنر جنرل سے ملاقات:

گی آنا ابھی تک جمہوریہ نہیں بنا تھا۔ ملک کا حکمران اعلیٰ گورنر کہلاتا تھا جسے تاج برطانیہ مقرر کرتا تھا۔ گورنر جنرل سر David Rose ملک کا دورہ کرتے ہوئے 3 فروری 1967ء کو نیو ایمسٹرڈم تشریف لائے تو جماعت احمدیہ کے نمائندوں نے بصورت وفد ملاقات کی درخواست کی جسے انہوں نے بڑی خوشی سے منظور کرلیا۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق منتخب نمائندوں کے ہمراہ ملاقات کی اور سپاسنامہ پیش کیا۔ دنیا بھر میں جماعت کی طرف سے بنی نوع انسان کی خدمات کا تذکرہ ہوا۔ گی آنا کے عوام کی مذہبی اور تعلیمی خدمات جو اس وقت مشن کررہا تھا اور ان خدمات کو مزید بہتر بنانے کے لئے جماعت کا جو پروگرام تھا اسے بھی بالتفصیل ان کے سامنے پیش کیا۔ نیز اس پروگرام کو آگے بڑھانے میں جو مشکلات درپیش تھیں اور جو حکومت کے تعاون سے حل ہوسکتی تھیں ان کے گوش گذار کیں۔ انہوں نے حکومت کی طرف سے ہر ممکن تعاون کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام اور احمدیت کی تعلیمات پر مشتمل کتب کا سیٹ انہیں پیش کیا گیا جس میں یہ کتب شامل تھیں۔ دیباچہ تفسیر القرآن انگریزی۔ اسلامی اصول کی فلاسفی انگریزی۔ ہمارے بیرونی مشنز انگریزی۔

احمدیہ بیت الذکر روز گنال کی تعمیر کا آغاز:

گی آنا احمدیہ مسلم مشن کی رجسٹریشن کے لئے درخواست دی ہوئی تھی لیکن ابھی تک حکومت کے زیر غور ہی تھی۔ حکومت کے رجسٹریشن سے متعلق محکمہ سے رجوع کیا گیا اور یاددہانی پر مقررہ ضابطوں کی تکمیل کے بعد مشن کی رجسٹریشن کی منظوری مل گئی۔ اب ہم اس قابل تھے کہ مشن کے نام جائیداد خرید سکیں۔ چنانچہ روزِ گنال گاؤں میں مسجد کے لئے ایک پلاٹ خرید اگیا۔

نومبر 1978ء میں روز گنال (Rosignal) میں احمدیہ بیت الذکر کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ فنڈز کی کمی کی وجہ سے پہلے مرحلے پر خاردار تار کی باڑ لگا کر پلاٹ کی حدود متعین کرلیں گئیں اور دوسرے مرحلے پر سمنٹ اور ریت کے بلاک بنانے شروع کئے۔ اتوار کے روز سسٹرز گاؤں (Sisters Village) کی جماعت کے احباب خصوصاً نوجوان سمنٹ اور ریت کے بلاک بنانے روز گنال آجاتے تا کہ اپنی مدد آپ

کے تحت بیت الذکر کی تعمیر جلد ہوسکے۔ بیت الذکر کا کام ابھی باحسن طریق سے جاری تھا کہ گی آنا میں میرا عرصہ قیام اختتام پذیر ہوگیا۔ تعمیر کا بقیہ کام نئے مربی انچارج کے سپرد کرتے ہوئے گی آنا کو الوداع کہا۔

ایک خیال جو چند سال بعد حقیقت بن گیا:

گی آنا میں داعی الی اللہ کا کام جاری تھا کہ 1967ء کی بات ہے۔ جماعت کا ایک نوجوان جو باصلاحیت اور سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ سماجی کاموں میں حصہ لینے کی وجہ سے بااثر بھی تھا۔ مذہب سے لگاؤ کے ساتھ ساتھ مذاہب کے مطالعہ کا بھی شوقین تھا۔ ہماری جماعت میں شامل ہونے سے قبل اس نے انجمن اشاعت اسلام لاہور کی شائع شدہ کتب کا مطالعہ بھی کسی قدر کیا تھا۔ اختلافی مسائل کا ادراک رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ مشن ہاؤس آیا اور دوران گفتگو اس خیال کا اظہار کیا کہ ابھی تک اسے شرح صدر نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے پیدا ہوئے تھے اس بارے میں وہ کافی تحقیق کرچکا ہے اور اب اس کی تحقیق اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ اس کا برملا اظہار کیا جائے۔ اور کہ اس سلسلہ میں اس نے ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے اور وہ اس کی اشاعت کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے اس خیال کا اظہار کبھی کبھار پہلے بھی کیا کرتا تھا۔ لیکن دلائل اور جماعتی موقف سننے کے بعد مطمئن ہوجایا کرتا تھا۔ خصوصًا جب اسے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریرات کا حوالہ دیا جاتا کہ امام وقت کا یہی فیصلہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن باپ پیدا ہوئے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل اب اس قابل نہیں تھے کہ ان کا کوئی فرد سلسلہ موسویہ کے آخری نبی کا باپ بنتا۔ نیز یہ کہ اب نبوت بنو اسحٰق سے بنو اسماعیل میں منتقل ہونے کا خدائی فیصلہ ہوچکا تھا۔ اس قسم کی گفتگو اس سے متعدد بار ہوچکی تھی۔ لیکن اس مرتبہ وہ اچانک بغیر اطلاع دفتر میں آیا اور یہی مسئلہ چھیڑ دیا۔ سیر حاصل گفتگو کے بعد کہنے لگا کہ اگر خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ میرے اس خیال کو رد کردیں تو پھر میں اپنے اس خیال کو ترک کردوں گا اور اپنی تحقیق اور جو دلائل قائم کئے ہیں انہیں منظر عام پر لانے کا ارادہ چھوڑ دوں گا۔ لہٰذا اس بارے میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ کو لکھا جائے۔ اس کی اس خواہش کے مطابق حضور کی خدمت میں لکھ دیا گیا۔ حضور کی طرف سے جواب آنے میں تاخیر ہوگئی۔ کیونکہ گی آنا اور پاکستان کے درمیان ڈاک کی آمد و رفت میں کم از کم ایک ماہ درکار ہوتا تھا اور دفتری خطوط میں دفتر کی کارروائی کی وجہ سے مزید وقت لگ جانا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ جواب کے بارے میں اکثر وہ دریافت کرتا۔ ایک روز

دریافت کرنے کے بعد جب وہ چلا گیا تو دفتر میں آویزاں دنیا کے نقشے پر نظر پڑی تو خیال آیا اور یہ خیال اچانک تھا کہ جماعت احمدیہ کا بین الاقوامی مرکز لنڈن (انگلینڈ) میں ہونا چاہئے کیونکہ یہ کرہ ارض کے خشک حصہ کا سنٹر لگ رہا ہے اور یہاں سے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تبلیغی مراکز سے رابطہ جلد اور آسان ہو جائے گا۔

یہ خیال جو اس وقت یوں تو دل کی آواز معلوم ہوتا تھا لیکن بظاہر یوں محسوس ہوا کہ یہ خیال خیالِ خام ہے۔ حقیقت کا روپ نہیں دھار سکتا۔ پھر یہ خیال نسیاً منسیاً ہو گیا لیکن خدا کی قدرت دیکھئے کہ قریباً سترہ سال بعد ایسے حالات نے جنم لیا کہ یہ خیال حقیقت بن گیا اور 1984ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع پاکستان سے ہجرت کر کے لنڈن تشریف لے گئے اور اس وقت سے جماعت کا بین الاقوامی مرکز لنڈن یو۔ کے (U.K) میں قائم ہے جہاں سے نہ صرف دنیا بھر میں قائم مشنوں سے روابط میں آسانی ہے بلکہ مسلم احمدیہ ٹیلی ویژن کے وہاں قائم ہونے اور اس کی گلوبل نشریات سے نہ صرف جماعت کے افراد مستفید ہو رہے ہیں بلکہ تمام دنیا کی پیاسی روحیں اس چشمۂ رواں سے فیضیاب ہو رہی ہیں۔

گورنر جنرل Sir David Rose میر غلام احمد نسیم مشنری انچارج سے اسلامی کتب لے رہا ہے

سورینام: استقبال

بائیں: میر غلام احمد نسیم مشنری انچارج گی آنا و سورینام
سورینام پہنچنے پر جماعت کے افراد استقبال کر رہے ہیں۔

4- ریڈیو پر مذہبی پروگراموں کی نشریات:

گی آنا میں ریڈیو ڈمرارا (Demrara) کے نام سے نشریاتی ادارہ حکومت کی نگرانی میں تمام پروگرام نشر کرتا تھا۔ ریڈیو کی انتظامیہ نے حکومت کی پالیسی اور ہدایت کے مطابق مذہبی پروگراموں کو نشر کرنے کے لئے کچھ وقت مقرر کر رکھا تھا اور پھر اس وقت کو مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندو میں ان کی آبادی کے تناسب سے تقسیم کر رکھا تھا۔ اس تقسیم کی آگے تقسیم در تقسیم ان مذاہب کے ماننے والے فرقوں کی ہوتی تھی۔ مسلمانوں کے لئے مختص وقت کو تین مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا کیونکہ اس مختص وقت کی تقسیم کے موقعہ پر تین مسلم رجسٹرڈ جماعتیں موجود تھیں یعنی احمدیہ مسلم مشن آف گی آنا، جماعت اہل سنت والجماعت اور انجمن اشاعتِ اسلام۔ ہم تینوں مسلم تنظیموں میں مسلمانوں کے لئے مختص وقت تین برابر حصوں میں تقسیم تھا اور ہر ایک تنظیم کی باری ہر ماہ ایک یا دو بار آتی تھی۔ اس مذہبی پروگرام کو ریڈیو پر نشر کرنے کے لئے کچھ شرائط مقرر تھیں جس میں سے اہم شرط یہ تھی کہ ہر فرقہ یا مذہب کا پروگرام اپنے مسلک یا مذہب کی خوبیاں بیان کر سکتا ہے دوسرے کسی مسلک یا مذہب کے بارے میں تنقید نہیں کر سکتا۔ حکومت کی ہدایات اور فیصلہ کے مطابق پروگرام نشر ہو رہے تھے کہ اچانک ایک روز محکمہ متعلقہ کی طرف سے اطلاع موصول ہوئی کہ مذہبی پروگراموں کی نشریات کے سلسلہ میں کچھ ضروری معاملات پر غور کرنے کے لئے ایک اجلاس طلب کیا گیا

ہے اس میں ہر ایک مسلم تنظیم نمائندے بھیجے۔مقررہ تاریخ پر ہمارے مقرر کردہ نمائندے پہنچ گئے اس طرح دوسری دونوں تنظیموں کے نمائندے بھی حاضر ہو گئے اور ڈائریکٹر کی صدارت میں اجلاس شروع ہوا۔اجلاس شروع ہوتے ہی اہل سنت والجماعت کے نمائندے نے یہ موقف اختیار کیا کہ احمدی کہلانے والے مسلمان نہیں ہیں اس لئے انہیں مسلمانوں کے لئے مختص وقت میں سے حصہ نہیں ملنا چاہئے۔اپنے اس موقف کو درست ثابت کرنے کے لئے دلائل شروع کر دئے۔ہماری طرف سے جواب دینے پر اس نے کج بحثی شروع کر دی۔جب یہ سلسلہ گفتگو طول پکڑنے لگا تو حکومت کے نمائندے نے جو مذہباً عیسائی تھا مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ گی آنا کی حکومت تینوں تنظیموں کو مسلمان سمجھتی ہے۔اسی لئے اس نے آپ تینوں کے نمائندوں کو بلایا ہے۔پھر اس نے اپنی مثال دیتے ہوئے کہا کہ میں عیسائی ہوں اور یہ کہ عیسائیوں کی کوئی بیس کے لگ بھگ تنظیمیں یا مشن الگ الگ ناموں سے گی آنا میں سرگرم عمل ہیں۔انہوں نے آپس کے اختلافات کو زیر غور لانے کے لئے یو۔سی۔سی (u.c.c) بنا رکھی ہے جبکہ آپ لوگ یعنی مسلمان جو اس ملک میں ہیں ان کی صرف تین تنظیمیں یا یوں کہیں کہ تین فرقے ہیں اور یہ فرقہ بندی بھی چھوٹے موٹے اختلافات کی وجہ سے ہے۔بہر حال حکومت گی آنا آپ کی تینوں تنظیموں کو مسلمان سمجھتی ہے۔لہٰذا ریڈیو پروگراموں میں وقت کی تقسیم حسب سابق جاری رہے گی۔ہم نے اس کے اس دانشمندانہ فیصلہ اور اپنے مذہب عیسائیت کا حوالہ دے کر ہمارے مخالفین کو شرمندہ کرنے پر اسے خراج تحسین پیش کیا اور خدائے برتر کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

گی آنا احمدیہ مشن کو قائم ہوئے ابھی چند سال ہی ہوئے تھے اس لئے ہماری جماعت کی تعداد زیادہ نہ تھی۔اگر عددی گنتی کو مدنظر رکھا جاتا تو پھر یقیناً ہمارے لئے ریڈیو پروگرام جاری رکھنا مشکل ہو جاتا۔لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ مدمقابل یہ دلیل نہ لایا بلکہ اختلافی مسائل کو چھیڑنے کی وجہ سے اپنے بچھائے ہوئے دام میں خود ہی پھنس کر رہ گیا۔

گی آنا میں قیام کے دوران پیغام حق دوسروں تک پہنچانے میں جو بھی ذرائع میسر تھے انہیں بروئے کار لانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی رہی۔پبلک ریڈیوں پر ہر ماہ نصف گھنٹے کا پروگرام برابر نشر ہوتا رہا۔مشن ایک ماہوار رسالہ مسلم ٹارچ لائٹ (Muslim Tarch Light) کے نام سے شائع کرتا تھا۔یہ رسالہ باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔مشن کے اس وقت کے مالی حالات کی وجہ سے یہ رسالہ

سائیکلوسٹائل میں شائع ہوتا تھا۔اس رسالہ میں مرکز سلسلہ کی خبریں،مشن کی مقامی کارکردگی اور مخالفین کی طرف سے لگائے گئے الزامات کے مدلل جوابات اور کم از کم ایک مضمون دین حق کی حقانیت پر ہوتا تھا۔اس کے علاوہ جہاں تک ممکن ہوتا گی آنا سے شائع ہونے والے اخبارات کے ذریعہ بھی پیغام حق کی اشاعت کی جاتی۔علاوہ ازیں گی آنا کے میڈیا سے بھی برابر رابطہ رہتا تھا۔

1968ء میں جب میں سورینام کے دورے سے واپس گی آنا آیا تو سنڈے کرانیکل (The Sunday Chronicle) کے نمائندے نے انٹرویو لیا جو 12 جنوری 1969ء کو مذکورہ اخبار میں مع خاکسار کی تصویر شائع ہوا۔اس انٹرویو میں گی آنا کے باشندوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ دین اسلام کی طرف توجہ دیں اور اسلام کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کریں۔چنانچہ اخبار کے نمائندے نے کم وبیش اسی سرخی کے ساتھ انٹرویو بالتفصیل شائع کیا۔انٹرویو کی نمایاں اور جلی حروف کی سرخی یوں تھی۔

(Sunday Cronicle January 12, 19969)

MORE GUYANESE SHOULD TAKE TO ISLAM

PAKISTAN BORN Moulana Ghulam Ahmad Nseem has been head of the Ahmadiyya Muslim Mision in Guyana, since his arival in the country a few months ago.

This earnest middle-aged graduate of the University of Pakistan, was recruited to preach the religion of Islam under the auspices of the Ahmadiyya Movement, found by Azrad Mirzaon of Quadian in Inida. It is a missionary movement which sponsors preachers of muslim faith in all parts of the world.

"I am the representative of that movment in this countyry" said Moulana whose assigment here can last for any time between one and fifty years.

"My duty is to propagate the faith of Islam wherever I go", he said last week. It is the confirmed belief of Muslims that the salvation of the world lies in Islam.

"According to the tenets of Islam there is no colour, no tribe, no race, and no status among men. Everyone is equal in sight of Allah. Islam teachers equality and this can bring about peace in the world", was his earnest declaration.

Likes it

As far back as the Moulana can remember, he had always

wanted to be a missionary. "From a youngster I had wanted to be a missionary, and now that I am one, I like the work very much".
In his homeland, yound boys who wanted a missionary carriear began specialised training soon after tey do the matriculation.

"After my formal school studies I entered a muslim misslonary colleges for four years", Moulana Naseem explained.

There he did extensive studeis which included the Holy Quran, the sayings or the prophet Mohammad, History of Islam, Philosophy and logic.

After college he attended a university in Pakistan where he obtained a master's degree in Arabic with hounours.
His wife who has a Bachelor of Arts degree and a teaching diploma is still in Pakistan with their three children.

"They might be coming to join me here during this year", he said. At present the only Moulana in the country M. Naseem speaks five languages.

"I can speak and write Arabic, Urdu, Punjabi, Persian and English." He also has conversational knowledge of "Timini" dialect of Slerra Leone in West Africa. He picked up the dilect in the early sixties when he was assigned there for a four-year period.

"I did missioary work there. I was the headmaster of the Ahmadiyya Muslim College situated in Bo, Sierra Leone."
In that country 65 percent of the coloured native population were Muslims by religion.

"They are all nice people and I would like to go back to that country," was his warm comment.

In 1963, he left Sierra Leone paid a teaching visit to Higeria where 70 percent of the population are Muslims.

In Nigeria the Muslims are practical people. They are professing Muslims and they kepp religious and they keep religious above politics.

While in Guans, Mr. Naseem is stationed at the Heaadqquarters of the Ahmadiyya Muslim Mission situated on Asylum street, New Amsterdam, Berbice.

He officiates at services in New Amsterdam and regularly conducts worship at mosques up and down the corentyne Coast.
Since my arrival here, we have had several converts mostly

Africans," he said, disclosing how the Ahmadiyya proposes to expand their programme of propagating the faith during the new year.

The organisation hopes so sponser three youths to be trained as missionaries in rabwah, Pakistan.

Moulana Naseem M. A. H. A. hopes that more people in Guyana would embrace the Muslim Faith

"Islam is a religion for all races. It teaches that all men what ever their colour, are equal."

دسمبر 1968ء کو ریڈیو ڈمرارہ (Demrara) کی دعوت پر 'عید الفطر' کے مبارک موقع پر خصوصی پروگرام نشر کیا گیا۔ یوں تو گی آنا میں ریڈیو پر مذہبی پروگرام ہر ماہ نشر ہوتے تھے اور احمدیہ مسلم مشن کا پروگرام نصف گھنٹے کا ہوتا تھا اور میرے وہاں قیام کے دوران یہ پروگرام باقاعدگی سے ہر ماہ نشر ہوتے رہے اور اب بھی نشر ہو رہے تھے لیکن ''عید الفطر'' کا یہ خصوصی پروگرام ایک غیر از جماعت خاتون کے تعاون سے خصوصی انتظامات کے تحت نشر ہوا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ گی آنا کے تمام باشندے خواہ وہ کسی بھی مذہب وملت سے تعلق رکھتے ہوں اسلام کے اس مبارک تہوار اور اس کے بڑے اہتمام سے منائے جانے کی اہمیت سے آگاہ ہوں اور یہ کہ انہیں اسلام اور اس کی روحانی اقدار کا علم ہو سکے۔

6- عیسائیوں کی فرقہ بندی اور طریق تبلیغ:

عیسائی مذہب کے بہت سے فرقے ہیں۔ فرقہ بندی کی وجوہات کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ بیشتر فرقے عقائد میں اختلاف کی وجہ سے وجود میں نہیں آئے بلکہ فرقہ بندی کی زیادہ تر وجوہات مالی فوائد، شخصیات کی سیاست، غریبوں اور پس ماندہ افراد کو نظر انداز کرنے اور انتظامیہ کا سیدھے راستہ سے انحراف اور عیاشیوں میں ملوث ہونے کے باوجود انتظامی عہدوں پر قابض رہنا اس فرقہ بندی کی بڑی بڑی وجوہات ہیں۔

گی آنا میں خدمات بجالانے کے وقت وہاں مذہبی جماعتوں کو سرکاری ریڈیو پر بعض شرائط کی پابندی کے ساتھ اپنے اپنے مذہب اور مسلک کے پروگرام نشر کرنے کی اجازت تھی۔ احمدیہ مسلم مشن آف گی آنا کو بھی پروگرام نشر کرنے کا وقت ملا ہوا تھا۔ اور پروگرام کے مطابق حصہ لیتے تھے۔ اسی طرح وہاں

کے سنّی مسلمان اور لاہوری احمدیوں کو بھی اپنے اپنے مسالک کی خوبیاں بیان کرنے کے لئے پروگرام کا وقت دیا گیا تھا۔ ایک مرتبہ وہاں کے سنی جماعت کے امام کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے ریڈیو کی انتظامیہ کو درخواست دی کی مسلمانوں کو الاٹ شدہ وقت سارے کا سارا سنّی جماعت کو دے دیا جائے۔ اس پر انتظامیہ نے تینوں جماعتوں کے راہنماؤں کو بلایا۔ جب میٹنگ کا آغاز ہوا تو سنّی جماعت کے امام نے چھوٹتے ہی کہا کہ احمدی مسلمان نہیں ہیں اس لئے مسلمانوں کے لئے جو وقت مختص ہے اس میں سے انہیں حصہ نہیں ملنا چاہئے۔ اس پر بحث شروع ہوگئی۔ کافی دیر کے بحث مباحثہ کے بعد حکومت کے نمائندے نے، جو صدارت کر رہا تھا، کہا کہ حکومت کے نزدیک آپ تینوں جماعتیں مسلمانوں کی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ حکومت آپ میں سے کسی کو مسلمان نہ سمجھے۔ گفتگو جاری رکھتے ہوئے اس نے مزید کہا کہ ہمارے اس دفتر کے سامنے سے جو سڑک گذر رہی ہے اس پر آپ چلتے جائیں تو صرف اسی ایک سڑک پر آپ کے دائیں اور بائیں کم از کم بیس عیسائی فرقوں کے چرچ آپ کو نظر آئیں گے۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ اپنے ممبروں کی خدمت کر رہے ہیں اور ان میں سے کسی نے بھی کبھی دوسرے فرقے کے خلاف شکایت نہیں کی بلکہ ان سب نے مل کر یونائیٹڈ کرسچن چرچ (ucc) کے نام سے ایک نگران انتظامیہ بنائی ہوئی ہے جو نہ صرف آپس کے مسائل حل کرتے بلکہ بعض امور حکومت کی بھی راہنمائی کرتے ہیں۔ اور ادھر آپ ہیں کہ صرف تین گروہ یا جماعتیں ہیں اور وہ بھی باہم دست و گریباں ہیں۔ حکومت آپ تینوں کو مسلمان سمجھتے ہوئے حسب سابق تینوں کے پروگرام جاری رکھتی ہے اور جاری رکھے گی۔

اس نمائندہ حکومت نے یہ فیصلہ دیتے ہوئے میٹنگ برخواست کر دی۔ اس کی اوپر بیان کردہ گفتگو سے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ عیسائیوں کے ان مختلف فرقوں کا جس قدر ممکن ہو سکے مطالعہ کرنا چاہئے کہ ان کے باہمی اختلافات کیا ہیں اور اگر عقائد کے سنجیدہ اختلافات ہیں تو یہ باہم دست و گریبان کیوں نہیں۔ چنانچہ میں نے وہاں قائم عیسائی چرچوں کے مشنریوں سے ملاقاتیں شروع کیں۔ سوچ یہ تھی کہ اس طرح پیغام حق پہنچانے کا موقعہ بھی ملے گا اور معلومات بھی حاصل ہوں گی۔ ان مطالعاتی ملاقاتون کے دوران پراٹیسٹنٹ (Protestant) کے منادوں کی اکثریت نے بتایا کہ ہمارے درمیان کوئی بنیادی اختلافات نہیں ہیں۔ اور جو ہیں وہ معمولی اور فروعی قسم کے ہیں۔ اختلافات کے سلسلہ میں زیادہ بحث مباحثہ سے گریزاں رہتے۔ اور کہتے کہ مخلوقِ خدا کی خدمت مقصود ہے جس طرح بھی ممکن ہو کر

رہے ہیں۔ ہر ایک فرقہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق مصروف عمل ہے۔ البتہ ان میں اکثر نے رومن کیتھولک چرچ سے ان کے جو بنیادی اختلافات ہیں اور پوپ کے احکام بے چون و چرا بجا لاتے ہیں۔ جبکہ ہم یعنی پروٹیسٹنٹ اس عقیدے سے متفق نہیں۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ انسان اور خدا کے درمیان براہ راست رابطہ قائم نہیں ہو سکتا بلکہ پادریوں کی وساطت سے ہوتا ہے وغیرہ۔

پروٹیسٹنٹ فرقوں کے کثرت سے وجود میں آنے کی وجوہات بتانے سے اکثر مشنریوں نے گریز کیا۔ تاہم یہ اعتراف کرنے سے گریز نہیں کیا کہ جب ایک فرقہ صحیح راہ پر نہیں چلتا تو بعض افراد اس سے الگ ہو جاتے ہیں اس طرح ایک نیا فرقہ وجود میں آ جاتا ہے تا کہ صحیح عیسائی اخلاقیات کے مطابق چلایا جا سکے اور وقت گذرنے کے ساتھ اس نئے فرقے میں بھی بے عملی اور بے راہ روی در آتی ہے اور ان میں سے پھر ایک نیا گروہ جنم لیتا ہے۔ یہ عمل صدیوں پر محیط ہے اور شائد یوں ہی جاری رہے گا۔

عیسائی منادوں کے طریق تبلیغ سے یہ بات سامنے آئی کہ زیادہ تر یہ لوگ سکولوں اور کالجوں کے ذریعہ عوام کو اپنے دام میں پھنساتے ہیں خصوصا پسماندہ ممالک مثلاً افریقہ، جنوبی امریکہ اور ایشیا کے بعض ممالک میں ان کے پرچار کا یہی کارگر طریق ہے۔ اس آزمودہ طریق کے علاوہ وہ لٹریچر کی اشاعت سے بھی کام لیتے ہیں لیکن لٹریچر کی تقسیم وہ گھر گھر جا کر بہت کم کرتے ہیں۔ البتہ ان کا ایک فرقہ جیہوہ وٹنس (Jehovah's Witnesses) کے مناد گھر گھر جا کر اپنا پیغام پہنچاتے ہیں اور لٹریچر بھی تقسیم کرتے ہیں۔

ایک دلچسپ گفتگو:

ایک روز چند احباب کسی کام سے تشریف لائے ہوئے تھے اور ہم مشن ہاؤس کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ جیہوہ وٹنس (Jehovah's Witnesses) فرقہ کے مشنری تشریف لائے اور ہمیں اپنے مشن کا کچھ تبلیغی لٹریچر دیا۔ ہماری دعوت پر وہ دفتر میں آ گئے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ گفتگو شروع ہوئی اور ہوتے ہوتے تثلیث کا موضوع زیر بحث آ گیا۔ ہم نے کہا کہ تین ایک اور ایک تین کا معمہ لاینحل ہے۔ اگر آپ اس مادی دنیا سے اس کی کوئی مثال دیں کہ ایک چیز بیک وقت ایک بھی ہے اور تین بھی تو پھر کچھ سمجھ آ سکتی ہے۔ انہوں نے انڈے کی مثال دیتے ہوئے کہا انڈا بیک وقت ایک بھی ہے اور تین بھی ہے یعنی انڈے کا چھلکا، اس کی سفیدی اور زردی۔ تین چیزیں ہیں اور پھر ایک انڈا ایک بھی ہے۔ ہم نے کہا کہ جب

انڈا ٹوٹ جاتا ہے تو تینوں چیزیں ختم ہو جاتی ہیں ۔اس پر وہ کہنے لگے ہاں یہ تو درست ہے۔ان کے اس بات کو تسلیم کرنے پر ہم نے کہا کہ کیا آپ یہ مانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر وفات پا گئے تھے اور تین دن کے بعد جی اٹھے تھے۔اس پر کہنے لگے ہاں یہ تو ہمارے عقیدے اور ایمانیات کا لازمی جزو ہے۔ ہم نے کہا جو انڈے کی مثال آپ نے دی ہے اس کے مطابق تین میں سے ایک کے صلیب پر مرنے سے گویا تینوں ہی ختم ہو گئے اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر تین دن کے لئے اس کائنات کو چلانے والا تو کوئی بھی نہ رہا اور یہ کائنات کیسے چلتی رہی؟ اس بات کو سننے کے بعد وہ سوچ میں پڑ گئے اور کچھ دیر بعد کہنے لگے اس لائن پر تو ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں اور پھر اٹھتے ہوئے کہا کہ کسی روز پھر ہم آئیں گے اور اس مسئلہ کا حل بتائیں گے۔اب اجازت دیجئے۔اس کے بعد ہم جب تک وہاں رہے انتظار ہی کرتے رہے اور وہ پھر کبھی نہ لوٹ کر آئے۔وہ تو واپس نہ لوٹے لیکن ان کے طرز عمل سے ہمیں یہ سبق ملا کہ مذہبی گفتگو میں زیادہ بحث اور تکرار سے گریز ہی کرنا چاہئے۔جس مسئلہ کا جواب معلوم نہ ہو اس کے بارے میں غیر ضروری بحث سے اجتناب کرنا ہی بہترین حکمت عملی ہے۔تکرار اور غیر متعلق دلائل سے فریق ثانی قائل نہیں ہوتا بلکہ متنفر ہو کر دور ہی دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔لہٰذا ایسے موقعہ پر گفتگو ختم کر کے یہ کہہ دینا ہی بہتر ہوتا کہ اس مسئلہ پر آئندہ ملاقات پر انشاء اللہ تفصیلی بات ہو گی اور ہاں دوبارہ ملنا بھولئے مت۔ایسی ملاقاتوں سے اخلاقی، روحانی اور علمی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔اس لئے تو کہتے ہیں 'یار زندہ صحبت باقی' اور پھر یہ بھی مشہور ہے باقی 'عند التلاقی'۔

28 جنوری 1968ء کو جماعتہائے احمدیہ گی آنا کی دوسری سالانہ کانفرنس منعقد ہوئی۔جماعتی روایات کو قائم رکھتے ہوئے اس کانفرنس میں بھی تعلیم و تربیت کے موضوعات پر تقاریر ہوئیں۔نمازوں کے وقت پر قیام اور حسن عبادات کو مدنظر رکھا گیا۔ملک بھر کی جماعتوں کے نمائندوں نے اس کانفرنس میں بھرپور انداز میں حصہ لیا اور اپنے ساتھ غیر از جماعت احباب کو بھی بکثرت ہمراہ لائے۔

احمدیہ بیت الذکر سسٹرز ویلج کی تعمیر نو:

گی آنا میں احمدیت میں شمولیت اختیار کرنے والے ابتدائی دوستوں کا تعلق بربیس کونٹی (Berbice County) سے تھا۔خصوصاً قصبہ نیو ایمسٹرڈم (New Amstedam) کے مضافات میں رہنے والوں نے سب سے پہلے احمدیت قبول کی۔یہی وجہ تھی کہ پہلے مربی جو گی آنا بھجوائے

گئے انہوں نے نیو ایمسٹرڈم میں ہی قیام کیا۔نیو ایمسٹرڈم کے چند میل کے فاصلے پر دریائے بربیس کے مشرقی کنارے پر سسٹرز ویلج (Sisters Village) نامی میں گاؤں باقاعدہ جماعت قائم ہوئی۔اس گاؤں کی مسلمان آبادی کے بیشتر افراد احمدیت میں شامل ہو گئے اور وہاں کی مسجد بھی احمدیہ مسجد کے نام سے موسوم ہوئی۔مسجد پرانی اور خستہ حالت میں تھی۔1968ء میں جماعت نے مسجد کو وسعت دے کر پختہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔یاد رہے کہ گی آنا میں عمارتیں اکثر لکڑی کی ہوتی ہیں۔اینٹ، ریت اور سمنٹ کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔بہرحال حسب فیصلہ مسجد پختہ تعمیر کرنے کا کام شروع ہوا۔ریت اور سیمنٹ کے بلاک تیار کرنے کے سلسلہ میں بسا اوقات وقار عمل (self help) کیا گیا۔تعمیر کے بیشتر اخراجات وہاں کی مقامی جماعت نے ہی برداشت کئے۔پرانی مسجد کا لکڑی کا ڈھانچہ قریب کے گاؤں ایڈنبرگ کو جہاں پر چند احمدی آباد تھے دے دیا اس طرح اس گاؤں میں بھی احمدیہ مسجد بن گئی۔یہ قصبہ ایک کھانڈ بنانے والے کارخانے اور گنا اگانے والے کھیت مزدوروں کی آبادی پر مشتمل تھا۔اس قصبہ کا انتظام وانصرام فیکٹری کی انتظامیہ ہی کے سپرد تھا۔اس بستی میں ایسے پلاٹ بھی تھے جو مذہبی اداروں اور عبادت گاہوں کے لئے مخصوص تھے۔ان ہی پلاٹوں میں سے ایک پلاٹ وہاں پر آباد احمدیوں کو باوجود سخت مخالفت کے محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے الاٹ ہو گیا۔اس قصبہ کے احمدی احباب سنٹر قائم ہونے سے قبل سسٹرز (sisters) جماعت کا حصہ ہی تھے اپنا سنٹر قائم ہونے پر اور مسجد تعمیر ہونے کی بنا پر خدا تعالیٰ کے فضل سے ایک نئی اور فعال جماعت قائم ہو گئی۔

3 اپریل 1970ء کو اس نئی مسجد کا افتتاح عمل میں آیا اور یہ عبادت گذاروں کے لئے کھول دی گئی۔اس کے ساتھ ہی یہ انتظام بھی کیا گیا کہ عصر کی نماز کے بعد بچوں کو اسی مسجد میں دینی تعلیم حاصل کرنے کا بندوبست کیا جائے۔بچوں کو دینی تعلیم دینے کے لئے مکرم امین خان صاحب مقرر ہوئے۔نیز وہاں کے احباب نے مکرم حسن بخش صاحب کو امامت کے فرائض ادا کرنے کے لئے منتخب کیا۔

6- ٹرینیڈاڈ میں احمدیہ انجم اشاعت اسلام لاہور کی کانفرنس:

اپریل 1969ء میں انجمن اشاعت اسلام لاہور کی طرف سے ٹرینیڈاڈ جزیرے میں کانفرنس منعقد کرنے کا انتظام کیا گیا۔اس کانفرنس میں شمولیت کے لئے گی آنا سے بھی چند افراد ٹرینیڈاڈ روانہ ہوئے۔روانگی سے قبل انہوں نے اخبارات میں یہ خبر شائع کروائی کہ جماعت احمدیہ کے احباب کانفرنس

میں شرکت کے لئے گی آنا سے روانہ ہوئے ہیں جس سے یہ تاثر پیدا کرنا مقصود تھا کہ اس کانفرنس میں شامل ہونے کی غرض سے جانے والے خلافت سے وابستہ بین الاقوامی احمدیہ جماعت کے ممبر ہیں اور یہ کہ اس کانفرنس کا انعقاد اور انصرام اس جماعت نے ہی کیا ہے۔ چونکہ گی آنا کے باشندوں کو اس کانفرنس میں شمولیت کی دعوت عام دی گئی تھی اور اس کا اعلان ایک سے زائد مرتبہ اخبارات میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ اس لئے اس تاثر کہ یہ کانفرنس ہمارے ٹرینیڈاڈ کے مشن کے زیر انتظام منعقد ہو رہی ہے کہ ازالہ کے لئے 'اخبار گی آنا گرافک'(Guyana Graphic) میں اصل حقائق پر مبنی مضمون شائع کروایا گیا اور اس بات کو نظام جماعت کی تاریخی تفصیل دیتے ہوئے واضح کیا گیا کہ جماعت احمدیہ جس کے ساری دنیا میں مشنز قائم ہیں اور دنیا بھر میں اشاعت اسلام کا کام سرانجام دے رہی ہے وہ نظام خلافت سے وابستہ جماعت ہے۔

''یہ جماعت حضرت مرزا غلام احمدؑ نے 1889ء میں قادیان (انڈیا) میں قائم کی۔ ان کا انتقال 1908ء میں ہوا اور ان کے جانشین حضرت مولانا حکیم نور الدینؓ مقرر ہوئے۔ مولانا حکیم نور الدین صاحبؓ کا انتقال جب 1914ء میں ہوا تو جماعت کے چند ممبر ان کی جانشینی کے مسئلہ پر جماعت سے الگ ہو گئے اور انہوں نے لاہور میں اپنا الگ مرکز بنا لیا اور اس طرح وہ لاہوری جماعت کہلائی۔ (گی آنا میں انہیں لاہوری اور ہمیں قادیانی کہا جاتا ہے)۔ یہ چند لوگ مولوی محمد علی کی قیادت میں اکٹھے ہوئے اور انہوں نے اس تنظیم کا نام ''احمدیہ انجمن اشاعت اسلام۔ لاہور'' رکھا۔ دوسری طرف اصل جماعت حضرت مسیح موعودؑ کے دوسرے جانشین حضرت الحاج مرزا بشیر الدین محمود احمدؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے متحد ہو گئی اور اب (1969ء میں) حضرت مرزا ناصر احمد صاحب حضرت مسیح موعودؑ کے تیسرے جانشین جماعت کی قیادت سنبھالے ہوئے ہیں اور ان کی نگرانی میں جماعت برابر ترقی پذیر ہے۔ جماعت کا بین الاقوامی مرکز ربوہ پاکستان میں ہے۔ اور گی آنا میں مقامی مرکز 22 ایسائلم سٹریٹ نیو ایمسٹرڈم (22 Asylum street New Amsterdam) میں ہے۔

چند افراد کا وفد جو گی آنا سے ٹرینیڈاڈ روانہ ہوا ہے وہ احمدیہ جماعت سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ وہ اصل جماعت سے الگ گروہ کے افراد ہیں جو احمدیہ انجمن اشاعت کے ممبر ہیں نہ کہ احمدیہ جماعت کے۔ یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے تا غلط فہمی کا ازالہ ہو سکے۔''

مولانا غلام احمد نسیم ایم اے
امیر و انچارج احمدیہ مشن

(یہ گی آنا گراف کے شمارہ 21 اپریل 1969ء میں شائع شدہ مضمون کے ایک حصہ کا انگریزی سے اردو آزاد ترجمہ ہے۔)

Islamic Convention

Sir-- I would like to draw the attention of the public through your esteemed paper to an item of news which appeared on 12th April under the heading Islamic Convention. It is stated that the president of Ahmadiyya Movement with other delegates left for Trinidad to take part in an Ahmadiyya convention. As this statement is liable to creat confusion by involving the actual Ahmadiyya Movement, therefore, it seems necessary to clarify the position:

Ahmadiyya Movement in Islam was founded by Hazrat Ahmad of Qadian (India) in 1889. He Passed away in 1908 and was succeeded by Maulana Hakim Noorud-Din, who died in 1914. On his death a small group of members broke away from the main body of the Movement on a dispute over a successor.

This group set up their own separate centre in Lahore and is known as Lahories. They made desperate efforts to gather themselves under the leadership of M. Muhammad. All and adopted the name of their organisation. Ahmadiyya Anjuman Ishat-i-Islam, Lahore. On the other hand, the main body of the movement remained united under the second successor of Hazrat Ahmad, Hazrat Alhaj Mirza Bashirud-Din Nahmood Ahmad, and then under the present head of the movement Hazrat Mirza Nasir Ahmad, the third successor of Hazrat Ahmad.

The international headquarters of the movement is at Rabwah, West Pakistan, and local headquarters is at 22 Asylum Street New Amsterdam.

The delegates who left Guyana for Trinidad are not members of the Ahmadiyya Movement. They are members of the broke-away group which is called Ahmadiyya Anjuman Ishat -- and not Ahmadiyya Movement. This Clarification is vital to avoid misunderstandings and confusions

MAULANA GHULAM
AHMAD NASEEM M. A.
(Amir and In charge Ahmadiyya Mission.)

7- 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

گی آنا میں دعوت الی اللہ کا کام حسب توفیق شب و روز جاری تھا کہ اسی دوران مشرق وسطی میں عرب اسرائیل کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ جو بعد میں چھ روزہ جنگ کے نام سے یہ جنگ مشہور ہوئی۔

فلسطین وہ خوش نصیب خطۂ ارض ہے جہاں خدا تعالیٰ کے انبیاء مبعوث ہوئے۔ اس خطہ ارض میں بہت سے مقدس مقامات ہیں یروشلم جسے مسلمان بیت المقدس کے نام سے موسوم کرتے ہیں واقعہ ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی روایات کے مطابق ان کے مذاہب کا آغاز فلسطین میں ہوا اور یروشلم میں ہی ان کے مقدس مقامات ہیں۔ مسلمانوں کا قبلہ اول یروشلم ہی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے واقعہ معراج میں بھی اس کا ذکر ہے۔ مسلمانوں کی فتوحات کے آغاز میں ہی یروشلم پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ مسلمانوں نے کمال فیاضی سے یہودیوں اور عیسائیوں کے مقدس مقامات کو نہیں چھیڑا بلکہ ان کو ان کی اصل حالت میں ہی رہنے دیا۔ حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کے حکم سے مسجد اس مقام پر تعمیر ہوئی جسے روایات کے مطابق آنحضرت ﷺ نے رؤیا میں دیکھا تھا۔ اس طرح مسلمانوں کے لئے قبلہ اول ہونے کے ساتھ ساتھ مسجد اقصیٰ کی وجہ سے یہ شہر مقدس ہوا۔

فلسطین کی تاریخ صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ کبھی اس پر یہودیوں کا کبھی عیسائیوں اور پھر ایک لمبا

عرصہ تک مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ صلیبی جنگیں بھی ہوئیں جن میں قریباً سارے یورپ کی عیسائی حکومتوں نے حصہ لیا اور بالآخر مسلمانوں کے ہاتھوں شکست فاش ان کے حصہ میں آئی۔ پھر زمانہ نے ایک اور کروٹ لی۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپ کی استعماری طاقتوں نے دنیا بھر میں ہر طرف یلغار کر دی۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ہی ان طاقتوں کے درمیان دنیا کے مختلف علاقوں پر قبضہ کے سلسلہ میں چپقلش شروع ہوگئی۔ 1914ء میں جنگ شروع ہوئی جسے جنگ عظیم اول سے موسوم کیا جاتا ہے اس جنگ کے دوران جو اکھاڑ پچھاڑ ہوئی اس کے نتیجہ میں برطانیہ نے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ چند سالوں کے بعد جنگ عظیم دوم شروع ہوگئی۔ اس جنگ کے اختتام پر اقوام متحدہ کا ادارہ قائم ہوا۔ برطانیہ کو فلسطین پر منڈیٹ حاصل ہوگیا۔ یہودی جو دنیا کے مختلف ممالک میں آباد تھے، حکومت برطانیہ سے ساز باز کر کے فلسطین میں بڑی تعداد میں آباد ہو چکے تھے اور چند سالوں میں ان کی تعداد اور قوت اس قدر بڑھ گئی کہ انہوں نے مئی 1948 میں ایک نئی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا اور اس نوزائدہ ریاست کا نام اسرائیل رکھا۔ نتیجۃً عرب اسرائیل جھڑپیں شروع ہو گئیں لیکن چونکہ برطانیہ اور دیگر استعماری طاقتوں کی حمایت اور مدد اسرائیل کو حاصل تھی اور ان کی خواہش بھی تھی کہ یہودیوں کی ایک الگ ریاست ہونی چاہئے تاکہ وہ خود یہود کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہ سکیں۔ لہٰذا انہوں نے اقوام متحدہ کے ذریعہ فلسطین کو تقسیم کر دیا۔ تقسیم کے نتیجہ میں کچھ علاقے اردن اور مصر کے حصہ میں آئے اور باقی سارا اسرائیل کہلانے لگا۔ فلسطینی جو بعد میں فلسطینی عرب کہلائے اور کہلاتے ہیں انہیں اسرائیلی علاقوں سے ہجرت کر جانے پر مجبور کیا گیا۔ یہ مہاجر پڑوسی ممالک میں خیمہ بستیوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔

اسرائیل نے 1967ء میں اردگرد کے عرب ممالک پر حملہ کر دیا اور چھ روز میں صحرائے سینا کے وسیع و عریض علاقہ پر قبضہ کرتے ہوئے نہر سویز تک پہنچ گئے۔ اور مشرق کی طرف اردن اور شام کے وسیع علاقوں پر بھی قابض ہوگئے۔ اس غیر معمولی واقعہ نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو انگشت بدنداں کر دیا کہ یہ کیا ہوا اور کیسے ہوا اور پھر یہ کہ آخر کیوں ہوا؟ ایک چھوٹے سے ملک نے اور پھر اتنی کم آبادی کے حامل ملک نے ان بڑے ممالک کو چھ روز میں ناقابل تلافی نقصان سے نہ صرف شکست دی بلکہ ان کے علاقوں پر قابض بھی ہوگیا۔ گی آنا میں مسلمانوں کی تعداد چنداں زیادہ نہیں لیکن جس سے بھی ملاقات ہوتی اس مختصر وقت میں لڑی جانے والی تباہ کن اور حیران کن مسلمانوں کی شکست پر تعجب کا اظہار کرتا اور دکھی نظر آتا۔ ایک معزز شخص جو گی آنا کے مسلمانوں میں خاصے مشہور تھے ایک مرتبہ گویا ہوئے کہ وہ کبھی عرب کے کسی ملک یا

مصر نہیں گئے اور نہ ہی وہاں کے باشندوں میں سے کسی سے متعارف ہیں۔ لیکن پھر بھی مسلمانوں کی اس شکست کی وجہ سے کئی راتیں آنکھوں میں کٹ گئیں۔ خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز رہا کہ اے رب مسلمان ہزار گناہ گار سہی لیکن تیرے اور تیرے بھیجے ہوئے رسول ﷺ کے نام لیوا تو ہیں۔ جنگ بدر کے موقعہ پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ 'یہ مسلمان اگر ہلاک ہو گئے تو تیرا نام لینے والا کوئی نہ ہوگا' اے اللہ تو ان کی مدد فرما۔

جب بھی کسی اجتماع وغیرہ کے مواقعوں پر مسلمان اکٹھے ہوتے اور ملاقات ہوتی تو اسی شرمناک شکست کا ذکر ہوتا۔ اور تأسف کا اظہار ہوتا۔ ایسے مواقع پر میرا جواب ہوتا کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کیلئے ایسا ناگہانی طوفان برپا کیا ہو۔ بقول شاعر:

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تاہم ایک بات واضح ہے کہ مسلمان خواہ خطۂ ارض کے کسی حصہ میں بھی ہوں اور یہ کہ خواہ کس قدر کم تعداد میں بھی ہوں۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے ہمدردی کا جذبہ موجزن ہوتا ہے اس جذبہ کو مہمیز لگانے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے عالمی تنظیم کی ضرورت ہے اور یہ تنظیم موجودہ زمانہ میں خدا تعالیٰ نے خود امام مہدی کے ظہور اور ان کے بعد خلافت کے نظام کے قیام کے ذریعہ مسلمانوں کو عطاء کر دی ہے۔ اب اس نظام سے فائدہ اٹھانا اسلامی دنیا پر منحصر ہے۔ اگر وہ غور کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کسی تنظیم کے تحت منظّم جد و جہد ہی وہ واحد ذریعہ ہے کہ جس سے عالمِ اسلام کو دنیا کے متعصّبانہ حملوں سے بچایا جا سکتا ہے۔

Time bomb in the mid-east

Sir-I read with great interest the most valuable article which appeared in the Sunday Graphic of March 8, entitled "The Time Bomb in Middle East". The publication of this article in your paper is a clear proof that the paer values and maintains a high standard maintains a high standard of journalism. The Middle East problem is deteriorating day by day. A deep understanding of the the problem may help to solve it and articles like this are helpful for the public to have an insight into the real causes of this burning

question of the day. For the benefit of the public i would like to add the following facts which i hope will find their way into the columns of your esteemed paper.

Palestine which in 1917 comprised land 10.163 square miles borded by Syria, Jordan, Egypt, Lebanon and the Meditervanian was conquered by the Philistined in the 12th Centuray BC. Subsequently, this pool land has been the subject of various invaders. For instance, Egyptians, Israelited, Babylonians, Assyrians, Persians, Turks and finally British. The world thought that at the end of British rule, complete sovereignty would be granted to Palestinian Arabs who were in the majority.

At the time of the British Mandate in 1917, 98%of the land was occupied by Palestinians who were Arabs. Only 2% fof the land was inhabited by Jews. The Jews over the course of centuries emigrated from the Middle East west-wards towards their colonies all over the globe. Eventually, they became an integral part of the nations whose citizens they were.

After the First and Second World Wars, the Jews of Europe flew from the countries of their settlement whin they realised that they could not economically survive in those countries under the people's governments. They dreaded the confiscation of economic monoply of exploitation of masseds of the indigenous population, and so they started to look for better porspects. Now after 2000 years of deserting it they seek refuge in Palestine, land which they had never seen but which they claimed was their homeland. These Jews had during the course of migration acquired either, first, second, third of fourth generation nationalaties in Europe and America. They had no link with Palestine except that of religion.

Jews are the only people on this earth who had dual nationalities and single allegiance. Zionists in the Western countries could become Israelis overnight. It must be remembered that one new Jew is one Palestinian Arab displaced--an Arab who holds one nationality and one allegiance. It must also be remembered that appraximatley 2,500,000 Palestinian Arabs who have spent all their lives from their homes to pave the way for European Jews population. It is clear injustice for the Palestinians.

It is colonisation in its real sense. In this twentieth century,we see the colonisation of Palestins by the poeple of foregin lands, through the help some foreign nations, right under our noses, yet we do not condemn.

According to the principles of demecracy which have been so widely preached and practised, the government should at all costs stand with the Palestinian Arabs who were in the majority in 1917. The land belonged to the indigenous Arabs. It has been forcibly confiscated. Contraryto democracy the Balfour Declaration, in actual fact,favourd the establish- ment of a national home for Jewish people in Arab's land.

The system of government in Palestiane has been imposed by foreign powers and the Arabs are striving to get rid of it with a view to creating a lasting, sovereign, democratic state for the Palestinians.

M. Ghulam Ahmad Naseem,M.A
10 Church St, New Amstedam
(Sunday (Guyana) Graphic 8, April 1970)

8- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صلیبی موت کی تردید:

گی آنا (Guyana) جنوبی امریکہ کے قیام کے دوران اپریل 1969ء کے شروع میں وہاں کے اخبارات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صلیبی موت کے بارے میں بحث شروع ہوئی۔ بہت سے مضامین اور خطوط اس موضوع پر اخبارات کی زینت بنتے گئے۔ اس بحث کا عنوان تھا۔ ''کیا عیسیٰ نے صلیب پر وفات پائی؟ (Did Christ die on the Cross?)۔'احمدیہ مسلم مشن آف گی آنا' نے بھی اس بحث میں بھرپور حصہ لیا۔ چنانچہ گی آنا کے کثیر الاشاعت اخبار سنڈے گرافک (Sunday Graphic) نے اپنی اشاعت مورخہ 27 اپریل 1969ء میں ہماری طرف سے بھیجا گیا مضمون جلی حروف کی سرخی ''مشنری صلیب پر وفات نہ پانے کی وجوہات بتاتے ہیں'' (Missionary gives Reasons for saying NO) کے ساتھ شائع کیا۔ اس مضمون میں بائبل کے حوالوں سے مسیح علیہ السلام کی الوہیت کی تردید کی گئی تھی۔ صلیبی موت اور پھر زندہ ہو کر عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق آسمان پر چلے جانے کو بائبل کے حوالوں سے رد کیا گیا تھا۔ نیز مسیح موعود علیہ السلام کے بنی نوع انسان کے

لئے نجات دہندہ ہونے کے عقیدے کو بھی بائبل کے حوالوں سے باطل ثابت کیا گیا تھا۔ اس مضمون کا اردو میں رواں ترجمہ درج ذیل ہے:۔

''اس مضمون کے لکھنے کا مقصد دوسرے مذاہب کو ماننے والوں کے مذہبی اعتقادات پر نکتہ چینی کرنا نہیں اور نہ ہی کسی خاص شخص کے خیالات کی وجہ سے اس پر تنقید کرنا ہے بلکہ صرف حق اور سچائی کا اظہار کرنا مقصود ہے۔ ایک مذہبی طالبعلم ہونے کی حیثیت سے مجھے اسلام اور عیسائی مذاہب کے مطالعہ میں خصوصی دلچسپی کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کی تعلیمات کے مطالعہ میں بھی دلچسپی ہے۔ اسی دلچسپی کی بنا پر اخبار سنڈے گرافک (Sunday Graphic . April 13 and 20) 13 اور 20 اپریل 1969ء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت و حیات پر جو تحریرات شائع ہوئی ہیں ان کو بڑے غور اور دلچسپی سے مطالعہ کیا ہے۔

مکرم گونتھر (Guenther) صاحب نے اپنے تفصیلی مضمون میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صلیبی موت کو بنی نوع انسان کے وراثتی گناہ سے نجات پانے کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے اسے ضروری قرار دیا ہے اور انہیں تثلیث کا دوسرا اقنوم قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا صلیب پر جان دینے کا مقصد انسانیت کو وراثتی گناہوں سے پاک کرنا تھا۔

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ تثلیث کے دوسرے اقنوم نہیں تھے تو دوسری دو باتوں یعنی صلیبی موت اور گناہوں کا کفارہ ہونے کو زیر بحث لانے کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن عوام کے فائدے کی خاطر ان تینوں باتوں پر اظہار خیال کرتے ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ کے دوسرا اقنوم ہونے کی تردید:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف یہ بات منسوب کرنا کہ وہ عقیدہ تثلیث کے تین اقنوموں سے میں دوسرے اقنوم ہیں بائبل کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے بلکہ خود حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کے بھی خلاف ہے۔ بائبل میں درج احکام میں سے پہلا حکم ہے۔ ''اے اسرائیل! سنو! ہمارا خدا ایک خدا ہے'' (استثناء 6:4) یہی حکم حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل مرقس میں خدا کے واحد ہونے کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ (Mark 12: 29) اگر وہ مزعومہ تثلیث کے دوسرے اقنوم ہوتے تو اپنے ماننے والوں کو کہتے کہ وہ انہیں

تثلیث کے دوسرے رکن کی حیثیت سے یاد کیا کریں۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اسی طرح یسعیاہ (Isaiah) میں لکھا ہے ''اس سے پہلے کوئی خدا نہ تھا اور نہ ہی میرے بعد کوئی ہوگا'' (یسعیاہ 43:10)
اگر عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یعنی عقیدہ تثلیث کے ماننے والوں کے مطابق دوسرے اقنوم کی حیثیت سے مستقبل میں انسانی شکل وصورت پر پیدا ہونا تھا تو پھر بائبل کی کتاب یسعیاہ کا یہ بیان درست نہیں پھر یہ بھی لکھا ہے کہ خدا ہی نجات دہندہ ہے اور دوسرا کوئی نجات دینے والا یا نجات کا باعث نہیں بن سکتا۔ ''میں خدا ہوں! اور اس کے علاوہ کوئی نجات دہندہ نہیں'' (یسعیاہ 43:11)۔ علاوہ ازیں انجیل کی کتاب مکاشفہ (Rev) میں لکھا ہے ''میں ہی اول وآخر ہوں، آغاز بھی اور انجام بھی'' (مکاشفہ 22:13)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت وحیات کا مسئلہ یہود اور عیسائیوں کے درمیان ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ وہ صلیب پر فوت ہوئے کیونکہ وہ نبوت کے دعویٰ میں جھوٹے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ بائبل کا یہ حوالہ پیش کرتے ہیں۔ ''اگر ایک آدمی گناہ کرتا ہے جس کی سزا موت ہے تو اسے درخت یعنی صلیب پر لٹکا دو......اور جسے صلیب دی گئی ہو وہ خدا کا ددکارہ ہوا ہے......'' (استثناء 21:22-23)۔ یہودیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام سچے نبی نہ تھے اور نبوت کا دعویٰ کرکے وہ ایسے گناہ کے مرتکب ہوئے تھے جس کی سزا صلیب پر موت تھی اور انہوں نے صلیب پر وفات پائی۔ عیسائی بھی یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی وفات صلیب پر ہوئی لیکن ساتھ وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ بنی نوع انسان کے لئے کفارہ ہوئے اور بعد میں جی اٹھنے کے بعد آسمان پر چلے گئے وغیرہ۔

اس کے برعکس قرآن کریم کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام نے صلیب پر جان نہیں دی بلکہ وہ صلیبی موت سے بچا لئے گئے تھے۔ خدا تعالیٰ نے انہیں ایسے ہی بچایا جیسا کہ یونس علیہ السلام کو اس نے اپنی قدرت سے مچھلی (whale) کے پیٹ سے زندہ نکال لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خون بہہ جانے کی وجہ سے بیہوش ہوگئے تھے اور یہ تصور کرلیا گیا کہ وہ موت سے ہمکنار ہوگئے تھے۔ اس لئے انہیں صلیب سے اتار کر ان کے حواریوں کے سپرد کردیا گیا اور ان کے حواریوں نے ان کی مناسب دیکھ بھال کی اور وہ تندرست ہوگئے اور روایات کے مطابق 120 سال کی اچھی خاصی عمر پا کر طبعی موت سے ہم آغوش ہوئے۔ دراصل اس وقت کے یہود نے فلسطین کے گورنر پیلاطوس (Pilate) کو مجبور کیا کہ وہ انہیں صلیب پر لٹکا دے لیکن بعد کے حالات نے جو صورت اختیار کی اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صلیب پر فوت نہیں

ہوئے بلکہ بے ہوش ہوگئے تھے اور بیہوشی کی حالت میں صلیب سے اتار لئے گئے تھے۔

درحقیقت اس زمانہ میں صلیب پر لٹکانے کے کافی دیر بعد مصلوب کی موت واقع ہوتی تھی۔ نیز اسی یقین کے بعد کہ مصلوب کی جان نکل گئی ہے پھر بھی مزید احتیاط کے لئے کہ مصلوب واقعہ میں موت سے ہم آغوش ہو چکا ہے اس کی ٹانگیں توڑ دی جاتی تھیں۔ بہرحال صلیب پر موت کافی وقت لیتی تھی اور پھر مصلوب کے جسم سے جو سلوک کیا جاتا تھا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے روا نہیں رکھا گیا۔ انہیں جمعہ کے روز شام کے وقت صلیب پر لٹکایا گیا اور اگلا دن یعنی ہفتے کا دن یہودیوں کا مذہبی تہوار یوم السبت (sabbath) تھا اور اس مقدس دن میں کوئی بھی مجرم صلیب پر لٹکا ہوا نہیں رکھا جاسکتا تھا اس لئے انہیں تین چار گھنٹے کے بعد صلیب سے اتار لیا گیا۔ خون بہہ جانے کی وجہ سے وہ بیہوش ہوگئے اور انہیں مردہ سمجھ لیا گیا اور ان کا جسم اطہر ان کے حواریوں کے سپرد کردیا گیا۔ حواریوں نے ان کے جسم کو ایک گنبد نما تربت میں رکھ کر ایک باغ میں رکھ دیا۔ چونکہ وہ زندہ تھے مگر بے ہوش تھے اور بیہوشی کی حالت رفع ہونے پر وہ تیسرے روز اس تربت سے (sepulchre) سے نکل آئے اور اپنا بھیس بدل لیا اور بعد ازاں گلیلی (Galilee) سے نکل آئے اور اپنا بھیس بدل لیا اور بعد ازاں گلیلی (Galilee) مقام پر اپنے حواریوں سے ملاقات کی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نجات دہندہ نہیں:

اگرچہ اب اس کی ضرورت نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نجات دہندہ نہ ہونے پر بحث کی جائے کیونکہ یہ قطعی طور پر ثابت ہوگیا ہے کہ وہ مزعومہ تثلیث کے دوسرے اقنوم نہیں اور کہ انہوں نے صلیب پر جان نہیں دی۔ تاہم انہیں نجات دہندہ تسلیم کرنے والوں کی خاطر بائیبل یعنی کتاب مقدس پر نظر ڈالتے ہیں کہ وہ اس سلسلہ میں کیا کہتی ہے۔ استثناء میں لکھا ہے:

''باپ کو بچوں (کے جرم) کی جگہ موت کی سزا نہیں دی جائے گی، نہ ہی بچوں کو باپ (کے جرم) کی جگہ سزا دی جائے گی، ہر شخص اپنے گناہ کی وجہ سے موت کی سزا پائے گا''۔ (استثناء 24:16)

پھر یسعیاہ میں لکھا ہے:

"میں خدا ہوں اور میرے سوا کوئی نجات دہندہ نہیں"(یسعیاہ 43:11)

بائبل سے دئے گئے ان تمام حوالوں سے ثابت ہوگیا ہے کہ وہ ایک انسان نبی تھے۔ اب یہ تسلیم کرنا کہ انہوں نے صلیب پر بنی نوع انسان کو ان کے گناہوں سے نجات دینے کی خاطر جان دی ایسا ہی ہے جیسے کسی فرضی داستان (myth) کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر یقین کرلیا جائے۔

اسلام میں گہری دلچسپی لینے کی ضرورت ہے:

گی آنا میں قیام کے دوران ہر خاص و عام تک پیغام حق پہنچانے کے لئے نئے نئے ذرائع کی برابر تلاش رہتی تھی۔ ذرائع ابلاغ ایک مؤثر ذریعہ تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اخبارات کے نمائندگان سے برابر رابطہ رہتا اور ہر اسلامی تہوار یا کسی اور مذہبی بحث شروع ہونے کے مواقع پر ہماری طرف سے اخبارات میں مضامین یا انٹرویو شائع ہوتے رہتے تھے۔ یکم مئی 1969ء کے شمارہ میں گی آنا گرافک (Guyana Graphic) نے خاکسار کا انٹرویو "اسلام میں گہری دلچسپی لینے کی ضرورت" (Need for deeper Interest in Islam) کے عنوان مع تصویر شائع کیا۔ اس مضمون میں یہ ذکر کیا گیا تھا کہ گی آنا کے عوام کو مذہب اسلام کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دینی چاہئے۔ اسلام ایک رواداری کا مذہب ہے اور اس میں کسی قسم کا نسلی امتیاز نہیں ہے۔ اس مضمون میں احمدیہ مسلم مشنز کی خدمات کا ذکر بھی کیا گیا تھا۔ گی آنا میں اس وقت تک مشن نے جو عوامی خدمات سرانجام دیں تھیں ان کا بھی مختصر ذکر تھا۔ بیوت الذکر اور ان میں مذہبی تعلیمات دئے جانے کے ذکر کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیمات پر عمل کرنے کی ضرورت کا ذکر تھا۔ گی آنا کی آبادی چونکہ مختلف نسلوں اور تہذیبوں پر مشتمل ہے اس لئے انٹرویو میں اس بات کو نمایاں طور پر بیان کیا گیا تھا کہ اسلام کی حقیقی تعلیم اور فلسفہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اسلام میں کوئی نسلی امتیاز نہیں اور وہ بھائی چارے کی تعلیم دیتا ہے۔

9- سیرت النبی ﷺ کے سالانہ اجلاس کا انعقاد:

گی آنا میں قیام کے دوران ہر سال سیرت النبی ﷺ کے اجلاس منعقد ہوتے رہے۔ اس موقع کی مناسبت سے افراد جماعت کے مقررین سیرت کے موضوع پر اظہار خیال کرتے۔ آنحضرت ﷺ کی

حیات مبارکہ کے مختلف پہلو بیان کر کے افراد جماعت کو تلقین کی جاتی کہ وہ اپنی روزمرہ زندگی کے اعمال اور کردار کو بہتر بنائیں۔ اس کے علاوہ مشن کی طرف سے یہ کوشش ہوتی کہ گی آنا کے اخبارات میں بھی آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ پر مضامین شائع ہوں تا عوام الناس مسلم اور غیر مسلم سب ان مضامین سے مستفید ہوسکیں۔ چنانچہ 29 مئی 1969ء کو گی آنا گرافک (Guyana Graphic) نے "سیرت النبی ﷺ" موضوع پر خاکسار کی طرف سے لکھا گیا ایک مختصر مضمون شائع کیا۔ یہ مضمون سیرت النبی ﷺ کا دن ہر سال منائے جانے کی مناسبت سے لکھا گیا تھا۔ عام طور پر مسلمان اس دن کو 'میلاد النبیؐ' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور گی آنا کے عوام بھی اس موقع کو اسی نام سے جانتے تھے اس لئے مضمون میں یہی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا کہ آپ ﷺ کی حیات مبارک کا ہر لمحہ اور اس میں کئے گئے افعال و اعمال کا ریکارڈ موجود ہے۔ گی آنا کے ملکی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے حضور ﷺ کی مذہبی رواداری کو نجران قبیلے کا حوالہ دیتے ہوئے نمایاں کیا گیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ارشاد مبارک "کان خلقہ القرآن" کہ آپ ﷺ کے اخلاق مبارک قرآن مجید کی تعلیم کا صحیح نمونہ تھے، کا حوالہ پیش کرتے ہوئے یہ بیان کیا گیا کہ اس مختصر جملہ میں آپؐ کی حیات طیبہ کو سمو دیا گیا ہے۔ آپ ﷺ کی حیات طیبہ کا مطالعہ مقصود ہو تو قرآن مجید کا مطالعہ کیجئے اور قرآن مجید کا صحیح مفہوم جاننا مقصود ہو تو آپ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کیجئے۔

ہمارا 'یوم سیرت النبی ﷺ' کی مجالس منعقد کرنے کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہم اس روز اپنے آپ سے عہد کریں کہ ہم اپنی زندگیوں کو آپؐ کی زندگی کے مطابق گذارنے کی پوری کوشش کریں گے اور اگر ماضی میں ہم سے اس معاملہ میں کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو اس کی خدا تعالیٰ سے معافی مانگتے ہوئے عہد کریں کہ آئندہ نہیں ہوگی اور کہ سچی توبہ کریں۔

اس مضمون کی اشاعت سے ایک روز قبل یعنی 28 مئی 1968ء کو اخبار 'Evening Post' نے "مسلمانوں کو پیغام" 'Message to Muslims' کے عنوان سے بھی یہی مضمون شائع کیا تھا۔

10- گی آنا سے واپس وطن روانگی:

خوش رہے خوب چنے پھول بہت شاد رہے
باغباں جاتے ہیں گلشن تیرا آباد رہے

گی آنا میں دعوت الی اللہ کا کام قریبًا سوا چارل سال کامیابی سے جاری رہا تبلیغی جہاد میں دن رات ایک ہوتا رہا۔ گی آنا کی جماعت نئی اور مختصر تھی۔ جماعت نے دینی کاموں میں پورا پورا تعاون کیا۔ ہر فرد اپنی جگہ ایک داعی رہا۔ تاہم مخالفت بھی برابر جاری رہی۔ گی آنا سے سورینام بھی جاتا رہا۔ سورینام میں مشن قائم ہونے کے کچھ عرصہ بعد نامساعد حالات سے دوچار ہونے کی بنا پر عارضی طور پر بند تھا۔ تاہم جماعت کے افراد عید اور بقرہ عید پر اکٹھے ہوتے تھے۔ گی آنا میں قیام کے ایک سال بعد وہاں کا دورہ کیا اور نتیجۃً جماعت فعال ہوئی۔ گی آنا میں جس قدر قدرت کو منظور تھا کام کیا۔ بیوی بچے پاکستان میں ہی تھے۔ اس لئے حسب قواعد تحریک جدید تین سال خدمت بجالانے کے بعد واپسی ہونی تھی لیکن بوجوہ ایسا نہ ہو سکا۔ نئے مبشر کے تقرر اور پاکستان سے گی آنا آمد مقررہ مدت میں ممکن نہ ہوسکی۔ لہٰذا مجھے مزید سوا سال قیام کرنا پڑا۔ اس عرصہ میں دعوت الی اللہ کا کام حسب دستور جاری رہا۔ بالآخر مکرم فضل الٰہی صاحب بشیر جون 1970ء میں تشریف لائے۔ انہیں مشن کے جاری کردہ منصوبوں سے متعارف کرانے اور مختلف جماعتوں کے تعارفی دورے کروانے میں کم و بیش ایک ماہ لگا۔

گی آنا میں جہاں کام کرنے میں دشواریاں پیش آئیں وہاں باوجود مالی تنگی اور مشکل حالات کے جس قدر مشن کے کام سرانجام پائے تھے ان سے گونہ اطمینان اور تسلی تھی۔ لہٰذا اس ملک کو الوداع کہنے میں ایک قسم کی اداسی طاری ہونا قدر کی بات تھی۔ جن احباب نے چار سال سے زائد عرصہ تک ہر عسر و یسر میں ساتھ دیا تھا وہ رہ رہ کر یاد آ رہے تھے۔ مذہبی مباحث بھی یاد آ رہے تھے جو بعض اوقات خوشگوار ماحول میں ختم ہوئے اور بسا اوقات ناخوشگوار ماحول بھی پیدا کرتے۔ وہ مساجد جو زیر تعمیر تھیں ان کی تکمیل کا تصور ذہن میں ابھرتا اور وہ مساجد جہاں جمعہ اور عیدین کے موقعوں پر احباب اکٹھے ہوتے اور گلے ملتے ان کی یاد ستانے لگتی۔ وہ شاگرد بھی یاد آتے جو دچار سال تک دینی تعلیم حاصل کرتے رہے تھے اور تصور ہی تصور میں ان میں سے بعض نونہالوں کو مستقبل کے فدائی تصور کرتا اور اس ملک میں اسلام کے روشن مستقبل کی تصویر

چشم تصور میں ابھرتی تو کسی شاعر کا یہ شعر زباں پر آ جاتا:

چراغ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئے گی فصل بہاراں ہم نہیں ہوں گے

انہی خیالات اور تصورات کو گلے لگائے ہوئے اور چار سال سے زیادہ عرصہ میں قائم کردہ تعلقات اور دوستیوں کو بالآخر الوداع کہا۔ جماعت کے احباب وقت وداع موجود تھے ان سے فردًا فردًا بغل گیر ہونے کے بعد بوجھل طبیعت کے ساتھ ہوائی مستقر کی طرف روانہ ہوا۔ چند دوست ہوائی جہاز کی پرواز تک موجود رہے۔ انہیں ہوائی جہاز میں داخل ہونے والے دروازے سے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے ہاتھ کے اشارہ سے الوداع کہا گویا ''اگلی منزل ہاتھ ہلاتی ہے اور پچھلی بیتیں یاد آتی ہیں''۔ دل یہ کہہ رہا تھا او یادو! تم کس قدر دلآویز ہونے کے ساتھ ساتھ کس قدر تکلیف دہ ہو۔

11- سورینام (Surinam) سابق ڈچ گی آنا

مختصر تعارف:

سورینام جنوبی امریکہ کے شمال مشرقی ساحل پر گی آنا اور فرنچ گی آنا کے درمیان واقع ہے اس کے جنوب میں برازیل ہے۔ سورینام کا کل رقبہ 63,039 مربعہ میل ہے۔ دار الحکومت پیرامار یبو (Paramaribo) ہے۔ یہ ملک کا سب سے بڑا شہر بھی ہے۔

آب وہوا:

خط استوا کے قریب واقعہ ہونے کی وجہ سے سورینام کی آب وہوا معتدل ہے۔ موسموں کی تبدیلی کا آب وہوا پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ برسات کے موسم میں خوب بارشیں ہوتی ہیں۔

آبادی:

سورینام کی آبادی افریقن، امریکن انڈین، انڈونیشین اور ہندوستانی باشندوں پر مشتمل ہے۔ افریقن کل آبادی کے نصف سے زیادہ ہیں۔ یورپ کی استعماری طاقتوں کے وہاں قابض ہونے اور پھر ان کے

آپس کے معاہدوں کے نتیجہ میں افریقن بحیثیت غلام اور دوسری اقوام کے باشندے بحیثیت مزدور سورینام میں پہنچے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ اصل باشندے امریکن انڈین ہیں جو اب بہت کم تعداد میں رہ گئے ہیں۔

مذہب:

آبادی کا اکثر حصہ عیسائیت کا پیروکار ہے۔ مسلمانوں اور ہنود کی تعداد بھی کافی ہے اور خال خال روائتی اعتقادات کے حامل بھی ہیں۔

12- سورینام کا پہلا دعوت الی اللہ کا دورہ:

گی آنا (Gyuana) میں دعوت الی اللہ کے فرائض ادا کرتے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ سورینام (Dutch Gyuana) جہاں ہماری جماعت کا مشن قائم تھا لیکن بوجوہ اس وقت یعنی 1966ء میں عملی کام نہیں ہو رہا تھا۔ سورینام میں جو مربی سلسلہ کی طرف سے مقرر ہوئے تھے وہ ملک چھوڑ چکے تھے۔ سورینام کے قصبہ نکیری کے ایک تاجر ہمارے مرکز گی آنا میں تشریف لائے ان کا تعلق ہمارے مشن سے تو نہ تھا لیکن وہ احمدی کہلاتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اگرچہ جماعت احمدیہ قادیان جس کا مرکز اب ربوہ ہے کا اب باقاعدہ مرکز تو سورینام میں اس وقت موجود نہیں تاہم چند افراد سورینام کے دارالحکومت پیرامار یبو (Paramaribo) کے مضافات میں اور خود پیرامار یبو میں موجود ہیں اور ان کا جماعت احمدیہ لاہور سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کے نزدیک جماعت کا ایک ایسا سربراہ ہونا ضروری ہے جس کے ارشادات اور احکامات جو شریعت اسلامیہ کے مطابق ہوں ماننا اور ان پر عمل کرنا اس جماعت کا ہر فرد ضروری سمجھتا ہو۔ اور کہ وہ اسے خلیفہ کا نام دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس سے جماعت کی شیرازہ بندی قائم ہوتی ہے۔ جماعت ترقی کی منازل جلد طے کرتی ہے اور شریعت کے احکام پر عمل پیرا ہونا بھی ضروری سمجھتی ہے۔

ان معلومات کے حصول کے جماعت احمدیہ سورینام اور مشن کے بارہ میں دفتر تبشیر ربوہ سے رابطہ کیا تو جواب آیا کہ سورینام کا مشن بند ہو چکا ہے اور وہاں جو مربی مقرر تھے وہ ملک چھوڑ چکے ہیں اور اگر جماعت احمدیہ کے افراد وہاں پر موجود ہیں تو ہمیں ان کا علم نہیں اور نہ ہی دفتر کے پاس کسی احمدی کا پتہ ہے جس پر خط وکتابت کی جاسکے یا مکمل رابطہ کیا جاسکے۔ اس جواب کے بعد 30 اگست 1967ء کو سورینام کا

دورہ کرنے کا پروگرام بنایا تاکہ معلوم کیا جاسکے کہ وہاں جماعت کے ایسے افراد موجود ہیں جو خلافت سے وابستگی کا اظہار کرتے ہیں نیز یہ کہ دیگر تبلیغی مواقع کس قدر موجود ہیں۔ گی آنا مشن کے مالی حالات کے مد نظر یہ سفر بذریعہ موٹر گاڑیوں کے کیا گیا۔ جو ان دنوں کافی دشوار گذار تھا۔ اس سفر میں ایک ہندو ٹیچر بھی ہمراہ تھا۔ ہم دونوں سورینام کے دارالحکومت 'پیرامار یبو' رات گئے پہنچے۔ شہر میں قیام کے لئے 'گی آنا' سے روانگی سے قبل ہی معلومات حاصل کر لی گئی تھیں۔ شہر کے وسط میں واقعہ ایک ہوٹل کا انتخاب تھا جو ارزاں بھی تھا اور جو وہاں کے دیگر مقامات کے رابطہ کرنے کے لئے بھی موزوں تھا۔ رات کافی گذر چکی تھی۔ رابطہ کرنے پر بتایا گیا کہ کم از کم دو دن کے قیام کے لئے کمرہ مل سکتا ہے۔ کرایہ بھی پیشگی ادا کرنا ہوگا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ایک دن کے لئے کمرہ لیں اور جائزہ لینے پر اگر مناسب ماحول ہوا تو مزید جس قدر قیام کرنے کا ارادہ ہوا کرایہ ادا کر دیں گے۔ مینجر دو روز سے کم پر کمرہ دینے کے لئے نہ مانا۔ بامر مجبوری دو یوم کا کرایہ ادا کیا۔ صبح ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر بالکونی میں بیٹھے دیگر پروگرام ترتیب دینے کے علاوہ اس سوچ میں گم تھا کہ جماعت احمدیہ کے افراد میں سے کسی سے رابطہ کیسے ہوسکتا ہے۔ کیونکہ میرے پاس کسی کا بھی ایڈریس یا فون نمبر نہیں تھا۔ اسی اثنا میں دو آدمی تشریف لائے۔ انہوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ جماعت احمدیہ لاہور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے بتلایا کہ وہ جماعت احمدیہ جس کا مرکز اب ربوہ ہے کا کچھ عرصہ صدر بھی رہا ہے لیکن جب سے ان کا مربی سورینام چھوڑ کر ملک سے چلا گیا ہے تب سے وہ جماعت احمدیہ لاہور کے ساتھ منسلک ہیں۔ گو کہ انہیں ان کی سب باتوں سے اتفاق نہیں تاہم اجلاسوں وغیرہ اور دیگر کاموں میں فی الوقت ان کے ساتھ ہی شامل ہیں۔ جب ان سے دریافت کیا کہ ہماری سورینام میں آمد کا انہیں کیسے علم ہوا تو کہنے لگے اس ہوٹل کا مالک احمدی ہے لیکن اس کا تعلق احمدیہ جماعت لاہور سے ہے۔ اور اس نے فون پر ہمیں اطلاع دی تھی۔ تعارف اور مختصر گفت وشنید کے بعد کہنے لگے کہ ہم آپ کو لینے آئے ہیں ہمارے ساتھ ہمارے گھر چلیں۔ انہیں بتلایا کہ ہم نے دو دن کا کمرے کا کرایہ دیا ہوا ہے۔ بہر کیف میں نے اپنی ساتھی سے رخصت لی اور ان کے ہمراہ ہو لیا۔ ان کے گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ وہ عبدالعزیز جمن بخش کے سوتیلے بھائی ہیں۔ مکرم عبدالعزیز جمن بخش صاحب 1950ء کی دہائی میں چند سال جامعۃ المبشرین ربوہ میں ہمارے ساتھ دینی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور تعلیم سے فارغ ہو کر سورینام میں ہی مربی مقرر ہوئے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ بطور مربی کام کرنے کے بعد نامعلوم وجوہ کی بنا پر سلسلہ کا کام

چھوڑ کر ہالینڈ جا چکے تھے۔

13- سورینام جماعت احمدیہ کا قیام:

سورینام میں احمدیت کا پیغام بیسوی صدی کے پہلے ربع میں ہی غالبًا پہنچ گیا تھا۔ یہ پیغام غالبًا وہ لوگ ساتھ لے کر وہاں گئے جو ہندوستان سے بطور کھیت مزدور اس دور میں وہاں پہنچے لیکن جماعت کی تنظیم بہت بعد میں عمل میں آئی۔ میں اگست 1967ء میں وہاں گیا۔ اس سے آٹھ نو سال قبل وکالتِ تبشیر تحریک جدید نے مرکزی مربی بھیج کر مشن کی داغ بیل ڈالی اور بکھرے ہوئے احمدی ایک لڑی میں پروئے گئے اور باقاعدہ جماعت کی تنظیم کا قیام عمل میں آیا لیکن چند سال کے اندر ہی نامعلوم وجوہ کی بنا پر یہ تنظیم وقتی طور پر ہی سہی مگر تعطل کا شکار ہوگئی۔ تاہم جب میں جمن بخش فیملی کے گھر پہنچا تو آہستہ آہستہ وہ افراد جو مشن بند ہونے کی وجہ سے اتحاد قائم نہ رکھ سکے تھے اکٹھے ہونے شروع ہوئے۔ ان افراد کی خلافت سے وابستگی قائم تھی لیکن تنظیم کے فقدان کی وجہ سے وہ کسی حد تک پریشان تھے۔ ان چند افراد میں سے حسینی عبید اللہ المعروف پایو پی اپنے اصول کی پاسداری اور عقائد کی پابندی پر سختی سے عمل پیرا تھا۔ وہ شہر پیرامار یبو کے مضافات میں افرائم سیخن (Ephrimsegen) میں رہتا تھا۔ اس نے وہاں پر اپنی ملکیتی زمین کا ایک پلاٹ مسجد کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ پلاٹ پر مسجد کی تعمیر بھی شروع کی ہوئی تھی۔ وہ چونکہ تعمیرات کا کام کرتا تھا۔ اس لئے جب بھی اسے موقعہ ملتا اور کچھ رقم بھی ہاتھ آ جاتی تو وہ مسجد کی مزید تعمیر شروع کر دیتا۔ آہستہ آہستہ اس وقت تک وہ مسجد کی چھت ڈال چکا تھا تاہم ابھی چھت کی تکمیل اور چھت کو مسجد کی شکل دینا یعنی چھوٹے موٹے مینار بنانے باقی تھے۔ گو زیادہ تعلیمیافتہ نہ تھا لیکن مضبوط اخلاق اور اچھی سیرت کا مالک ہونے کے علاوہ اصولوں کا سخت پابند تھا۔ اس کی بیوی بھی کسی قدر اسلامی تعلیمات سے واقف تھی اور وقتًا فوقتًا بچوں کو پڑھاتی تھی۔ خصوصًا اسلام کے بنیادی اصولوں سے ان کو بہرہ ور کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ میرے وہاں پہنچنے پر خلافت سے وابستہ چند افراد وہاں پہنچے ان میں حسینی عبید اللہ بھی تھا۔ تعارف کے بعد کچھ دیر گفتگو ہوتی رہی پہلے تو ان کا خیال تھا کہ میں ان کے ساتھ افرائم سیخن چلوں لیکن تفصیلی گفتگو کے بعد طے پایا کہ کچھ دن مَیں جمن بخش کے ہاں ہی قیام کروں اور پھر ان کے ہاں منتقل ہو جاؤں۔ چند روز وہیں قیام کے فیصلہ کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں پاکستان سے مولانا نورانی سورینام کے دورے پر تھے اور احمدیت کے

خلاف جابجا پُر زور تقاریر کر رہے تھے ایک پمفلٹ بصورت اشتہار چھپوا کر ملک کے طول و عرض میں تقسیم کیا جا رہا تھا۔ وہاں پر جو احمدی انجمن اشاعت اسلام لاہور سے تعلق رکھتے تھے ان کا اصرار تھا کہ مَیں مولانا نورانی کی طرف سے جماعت احمدیہ کے خلاف لگائے گئے الزامات کا جواب دوں۔ الزامات ایک اشتہار کی صورت میں چھپے ہوئے موجود تھے۔ ان الزامات کے جواب دینے کے لئے وہ شہر 'پیرامار یبو' میں واقعہ مرکز میں ایک پبلک اجلاس منعقد کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کا وفد ایک سے زائد مرتبہ رابطہ کر چکا تھا اور اس مرتبہ جو وفد آیا اس کا اصرار تھا کہ ان کی شرائط کے مطابق الزامات کے جوابات دئے جائیں۔ اس پر مَیں نے وفد کو کہا کہ اگر آپ لوگ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں کہ میں ان اعتراضات اور الزامات کا جواب دے سکتا ہوں تو پھر شرائط عائد نہ کریں مجھ پر اعتماد کریں۔ انہوں نے باہم مشورہ کے بعد میری رائے کو تسلیم کر لیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مرکز میں ایک پبلک اجلاس کا انتظام کیا جس میں بہت بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ مَیں نے ان اعتراضات اور الزامات جو جماعت احمدیہ کے خلاف ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع شدہ تھے مقدور بھر شافی جوابات دئے۔ بعد میں بعض وضاحتیں بھی بصورت سوال و جواب ہوئیں اور رات گئے یہ اجلاس بحسن و خوبی اختتام پذیر ہوا۔

جماعت احمدیہ سورینام کی شیرازہ بندی:

مرکز ربوہ کی طرف سے مرکزی مربی سورینام میں نہ ہونے کی وجہ سے جماعت کا شیرازہ وقتی طور منتشر ہو چکا تھا۔ لیکن چند افراد اب بھی اپنے فیصلہ پر قائم تھے اور کبھی کبھار افرائم سیخن میں جمع ہوتے خصوصًا عید کے تہواروں یا کسی اور اہم موقعہ پر اور تجدید عہد کرتے اور خلافت سے وابستگی ترقی کی منازل طے کرنے کے لئے ضروری ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ افرائم سیخن میں ایک مخیّر اور مخلص دوست نے ایک قطعہ زمین مسجد کی تعمیر کے لئے مخصوص کر رکھا تھا اور تعمیر بھی شروع کر رکھی تھی۔ لہٰذا چند روز جمن بخش صاحب کے ہاں قیام کے بعد افرائم سیخن پہنچا تو چند اور احباب بھی تشریف لے آئے۔ ان کے ذریعہ پورے واقعات اور حقائق کا علم ہوا۔ پھر جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لئے مزید افراد تشریف لائے۔ مختصر اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں فیصلہ کیا گیا کہ احمدیہ مشن پھر سے قائم کیا جائے اور افرائم سیخن کی مسجد کو عارضی طور پر بطور مرکز قرار دیا جائے۔ یہیں پر جماعت کے اجلاس ہوں۔ بچوں کی تعلیم اور تربیت کے لئے اتوار کو کلاس لگائی جائے۔

اسی اجلاس میں جماعت کی تنظیم نوعمل میں آئی جماعت کا مقامی صدر اور دوسرے عہدیدار مقرر ہوئے۔

سورینام کا یہ دورہ چونکہ عارضی تھا اور کسی منصوبہ کے تحت عمل میں نہیں آیا تھا اس لئے چند دنوں کے قیام کے بعد گی آنا گیا۔ روانگی سے قبل یہ بھی فیصلہ ہوا کہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے دوبارہ دورہ کیا جائے یہ بھی طے ہوا کہ زیر تعمیر مسجد کی جلد تکمیل ہو اور کہ جب دوبارہ دورے پر جاؤں تو مسجد کا افتتاح بھی پروگرام میں شامل ہو۔ گی آنا واپس پہنچ کر جماعتی کاموں میں مشغول رہنے کے ساتھ ساتھ سورینام کی جماعت سے باقاعدہ رابطہ رہا۔ وہاں کی جماعت کے اپنے طور پر اجلاس ہوتے رہے۔ جن کی رپورٹیں ملتی رہیں۔ باہمی رابطے اور مشورے سے طے پایا کہ سورینام کا ایک تفصیلی دورہ کیا جائے اور ملک کے طول و عرض میں پیغام حق پہنچانے کے لئے مختلف مقامات پر جلسے کئے جائیں اور مسجد کے افتتاح کی تقریب بھی منعقد ہو۔

14- سورینام کا باقاعدہ اور بامقصد دورہ:

سورینام کے پہلے دورے کا ذکر ہو چکا ہے۔ جو بظاہر کسی خاص منصوبہ اور پروگرام کے بغیر عمل میں آیا تھا۔ تاہم اس دورے کے نتیجہ میں وہاں پر جماعت کی ابتدائی شیرازہ بندی ہوئی تھی۔ اور بکھرے ہوئے افراد کو ایک لڑی میں پرو دیا گیا تھا اور مجلس عمل قائم ہو چکی تھی۔ جس کے گاہے بگاہے اجلاس منعقد ہوتے تھے۔ باہم مشورے اور ہمارے ساتھ رابطے کے بعد طے پایا کہ سورینام کا تفصیلی دورہ کیا جائے۔ اس فیصلہ کی روشنی میں سمندری جہاز کے ذریعہ پیرامار یبو پہنچا۔ افراد جماعت استقبال کے لئے موجود تھے۔ اس سے قبل وہاں کے مقامی ریڈیو پر جماعت احمدیہ کے مربی کی آمد کی خبر نشر ہو چکی تھی۔ جماعت کی مجلس عاملہ نے ایک تفصیلی پروگرام تیار کیا ہوا تھا جس میں ''ریڈیو سورینام'' پر ''اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے'' کے عنوان پر تقریر نشر کرنا اور ملک کے طول و عرض میں مختلف مقامات پر جلسے اور سیمینار منعقد کرنا شامل تھا اور یہ کہ جلسہ سے قبل ہر جلسے کے مقام اور موضوع کی خبر مقامی ریڈیو پر نشر کروائی جایا کرے گی۔ چنانچہ ترتیب دیئے گئے پروگرام کو مدنظر رکھتے ہوئے 15 مئی 1968ء کو دوسری مرتبہ سورینام کے دارالحکومت پارامار یبو پہنچا۔ اس مرتبہ سورینام کی جماعت نے افرائم سیخن جو پیرامار یبو کے مضافات میں ایک قصبہ ہے، میں قیام کا انتظام کیا ہوا تھا۔ اس دورے کے دوران سورینام میں مختلف مقامات پر تقاریر اور خطابات کا جماعت نے پہلے سے

پروگرام ترتیب دے رکھا تھا۔ چنانچہ حسب پروگرام دورے کئے اور حسب توفیق تقاریر بھی کیں ان خطابات کا زیادہ تر موضوع اسلام کی سچائی اور حقانیت ہوتا اور کہ اسلامی پیشگوئیوں کے مطابق حضرت مسیح موعود علیہ السلام تشریف لے آئے ہیں تا اسلام کا ساری دنیا میں بول بالا ہو۔ ان کی قائم کردہ جماعت ساری دنیا میں تبلیغ اسلام کا فریضہ ادا کر رہی ہے۔ جماعت کسی نئے مذہب کا پیغام نہیں ہے بلکہ اسلام ہی احمدیت ہے۔ دراصل ان مجالس میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ دوسرے دوسرے مذاہب کے لوگ بھی ہوتے تھے اس لئے اسلام کی سچائی اور حقانیت سے اکثر آغاز کیا جاتا تھا۔ اس دورے میں ریڈیو پروگرام بھی نشر کئے۔ مختلف طبقات اور مذاہب کے لوگوں میں ملاقاتیں کر کے پیغام حق پہنچایا گیا۔ سورینام میں انڈونیشین لوگ بھی آباد ہیں ان کی دعوت پر ان کے بعض مراکز میں بھی جماعتی عہدیداروں کے ہمراہ گئے۔ تعلیمی اور تربیتی امور پر خطابات کے ساتھ ساتھ پیغام حق بھی پہنچایا۔ بعض مقامات پر مذاکرات اور مباحثے بھی ہوتے رہے۔

ایک ناخوشگوار واقعہ:

اس موقعہ کے دورے میں سب سے اول نمبر پر سورینام کے ٹی۔وی کے دفتر میں اسلام کی حقانیت اور کہ اسلام بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کا ذریعہ ہے کے موضوع پر تقریر ریکارڈ کروائی جو اسی روز شام کے ٹی۔وی پروگرام میں نشر ہوئی اور اگلے روز کے اخبارات میں بھی بطور خبر شائع ہوئی۔ اس سفر کا مقصد چونکہ وسیع پیمانے پر دعوت الی اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانا تھا۔ اور اس مقصد کو کامیاب بنانے کے لئے تمام وہ ذرائع جو قانون کے اندر رہ کر اختیار کئے جا سکتے تھے ان کو بروئے کار لانے کا فیصلہ ہوا۔ لہٰذا دارالحکومت پیرامار یبو کے مضافات کے ایک محلّہ میں ایک احمدی کے گھر جس کا وسیع صحن اور برآمدہ تھا ایک اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا اور ایک مقامی ریڈیو پر اس اجلاس کی خبر نشر ہوئی۔ خبر میں یہ بھی ذکر تھا کہ اجلاس کے اختتام پر سوال و جواب کی مجلس بھی ہوگی لیکن بحث و تمحیص کی اجازت نہیں ہوگی تاہم اگر بحث کی ضرورت محسوس ہوئی تو بعد میں موقعہ دیا جا سکے گا۔ اجلاس کے انعقاد کے لئے جو وقت مقرر تھا اس پر صرف احمدی احباب تشریف لائے۔ غیر از جماعت کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ قریباً نصف گھنٹے کے انتظار کے بعد صدر صاحب جلسہ جو اس وقت جماعت احمدیہ سورینام کے صدر بھی تھے ارشاد فرمایا کہ جماعت کے افراد کی تربیت اور ان کو نصائح کے موضوع پر تقریر کی جائے۔ چنانچہ اجلاس شروع ہو گیا۔ اجلاس شروع

ہوئے ابھی کوئی نصف گھنٹہ ہی گذرا ہوگا کہ غیراز جماعت لوگ جوق در جوق آنے شروع ہو گئے۔ان کے آنے پر جماعت کے افراد نے احتراماً سٹیج کے سامنے والی کرسیاں خالی کر دیں تا کہ مہمان افراد ان پر بیٹھ سکیں۔کثرت سے مہمانوں کی آمد پر صدر صاحب جلسہ نے ہدایت کی کہ موضوع خطاب میں ترمیم کر کے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی آمد اور صداقت پر اظہار خیال کیا جائے۔اس موضوع پر قریباً سوا گھنٹہ تقریر کی۔تقریر ختم ہونے پر صدر صاحب نے سوال و جواب کی محفل کے انعقاد کا اعلان کیا۔چونکہ صدر صاحب کو بعد میں تشریف لانے والوں کے تیور کا اندازہ ہو چکا تھا اور رپورٹ بھی مل چکی تھی کہ ان کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔اس لئے انہوں نے اعلان کیا کہ ایک وقت میں ایک ہی سوال کیا جائے کیونکہ دوبارہ سوال یا مزید وضاحت چاہنے کی صورت میں اجلاس بحث کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔تاہم اگر سوال کنندہ کو کسی معاملہ میں مزید وضاحت کی ضرورت ہو تو وہ اجلاس کے ختم ہونے پر مزید وضاحت کے لئے مزید سوال کر کے تسلی کر سکتا ہے۔اس پر غیراز جماعت جو پہلے ہی فتنہ پیدا کرنے کی منصبہ بندی کئے ہوئے تھے اعتراض کیا کہ ریڈیو پر جو اعلان ہوا تھا اس میں اس بات کا ذکر نہیں تھا۔اس اعتراض کے ساتھ ہی جلسے کی سٹیج پر خالی بوتلیں اور پتھر پھینکنے شروع کر دئے گئے۔اتفاق سے جس جگہ سٹیج تھی عین اس کے پیچھے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جو گھر کی پچھلی طرف کھلتا تھا۔سٹیج سیکرٹری اور دو دوسرے احمدی جو سٹیج کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے فوراً مجھے پکڑ کر اس دروازے سے باہر نکالا۔گھر کی پچھلی طرف درختوں کے جھنڈ تھے اور اس کے بعد دھان کے کھیت تھے۔ان درختوں کی اوٹ سے گذرنے کے بعد دھان کے کھیتوں میں چل پڑا اور اس طرح ان کے شر سے خدا تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔بعد میں معلوم ہوا کہ شرارت پسند آپس میں الجھ پڑے کہ شکار ہاتھ سے نکلنے کیوں دیا۔ایک دوسرے پر الزام لگانے لگے کہ مکان کی پچھلی طرف آدمی مقرر کیوں نہیں کئے گئے اور گھر کا پوری طرح محاصرہ کیوں نہیں کیا گیا۔

اس افراتفری میں سٹیج کی میز پر رکھا ہوا میرا ہینڈ بیگ جو وہیں رہ گیا تھا۔ایک مولوی صاحب جو عرف عام میں ''چٹن'' کے نام سے یاد کئے جاتے تھے نے اٹھا لیا۔اسے بیگ اٹھاتے ہوئے ایک احمدی نے دیکھ لیا۔اس بیگ میں قرآن مجید کا چھوٹے سائز کا ایک نسخہ اور دیگر ضروری کاغذات کے علاوہ میرا پاسپورٹ بھی تھا جس کے بغیر میں سفر نہیں کر سکتا تھا۔دوسرے روز ہم پولیس میں رپورٹ درج کرانے گئے اور سارا واقعہ بیان کیا اور یہ بھی بتایا کہ فلاں مولوی صاحب بیگ اٹھا کر لے گئے ہیں۔مولوی صاحب مذکور

اسی شہر میں رہتے تھے نام اور پتہ بھی بتلایا۔پولیس انسپکٹر نے فوراً پولیس اس کے گھر بھجوائی۔ہمارا ایک آدمی بھی ساتھ تھا۔پہلے تو انہوں نے بیگ کے ان کے پاس ہونے یا اس کے بارے میں کسی قسم کے علم ہونے سے انکار کر دیا۔پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد گھر کے اندر چلے گئے اور کچھ دیر بعد گھر کے پچھلے دروازے سے بیگ ہاتھ میں تھامے ہوئے برآمدہ ہوئے اور کہا کہ کسی لڑکے کو یونہی پڑا ہوا ملا تھا وہ اٹھا لایا تھا۔بیگ میں سے کچھ چیزیں تو غائب تھیں لیکن پاسپورٹ موجود تھا جس کی اشد ضرورت تھی۔واپس پولیس اسٹیشن پہنچے تو پولیس انسپکٹر نے چوری کی رپورٹ درج کروانے کے لئے کہا۔ہم نے باہم مشورہ کے بعد اسے بتایا کہ ہم نے اسے معاف کر دیا ہے۔ان کے خلاف رپورٹ درج کرنے یا کسی دوسری کارروائی کی ضرورت نہیں۔

اس تبلیغی دورے میں ملک کے بعض دیگر مقامات پر بھی گئے۔جہاں جلسے کے انعقاد کا امکان ملا وہاں جلسہ بھی کیا اور انفرادی رابطہ کے ذریعہ بھی پیغام حق پہنچانے کی کوشش کی۔جماعت کے افراد نے عموماً اور انتظامیہ کے افراد نے مقدور بھر تعاون کیا۔پیغام حق پہنچانے کے ساتھ ساتھ افراد جماعت کی تعلیم و تربیت کا کام بھی باحسن طریق جاری رہا۔

جماعت کی باقاعدہ شیرازہ بندی:

قریباً ڈیڑھ ماہ کی متواتر جدو جہد کا سب سے بڑا ثمر یہ حاصل ہوا کہ جماعت جو چند سال پہلے بوجوہ منتشر ہو چکی تھی پھر متحد ہوئی اور خلافت سے وابستگی کا عہد کیا۔جماعت کے عہدیداروں کا دوبارہ انتخاب عمل میں آیا۔مسجد جو گذشتہ کئی سالوں سے زیر تعمیر تھی۔خدا تعالیٰ کے فضل سے تعمیر کے تمام مراحل طے کر کے مکمل ہوئی اور اس طرح سورینام کے احمدی افراد کو ایک مرکز مل گیا گو کہ مرکز سلسلہ کی طرف سے کوئی باقاعدہ مربی ابھی تک نہیں بھیجا گیا تھا۔

تاہم جماعت اب اس قابل ہو چکی تھی کہ کسی مرکزی مربی کی رہائش کا انتظام کر سکے۔جماعتی کاموں کو احسن طریق سے چلانے کے لئے یہ طے پایا کہ حسینی عبید اللہ جو پایو پی کے نام سے......معروف تھے کے گھر جو مسجد کے قریب ہی تھا جماعت کے اجلاس ہوں تا آنکہ جماعت کوئی مستقل مرکز حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔چنانچہ جماعتی عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔مکرم حسینی عبید اللہ صاحب (حسینی بید اللہ) صدر جماعت احمدیہ سورینام اور مکرم واحد علی صاحب سیکرٹری منتخب ہوئے جن کی فوری منظوری دے

دی گئی اور اس کی اطلاع دفتر تبشیر ربوہ کو بھجوا دی گئی۔ انتخاب کے بعد زیر تعمیر بیت الذکر (مسجد) کو جلد از جلد مکمل کرنے کے لئے فنڈز کے حصول سے ذرائع پر غور کیا گیا۔ اس کے علاوہ دیگر امور مثلاً بچوں کی تعلیم اور جماعت کی تربیت کے امور پر بھی غور ہوا اور مناسب فیصلے کئے گئے۔ ان سب امور کی سرانجام دہی پر یہ دوسرا اور بامقصد دورہ اختتام پذیر ہوا اور یکم جولائی 1968ء کو گی آنا واپسی ہوئی۔

ایک دلچسپ گفتگو:

تبلیغی دوروں کے دوران بعض دلچسپ مواقع جن میں باذوق مزاح کا پہلو ہوتا بھی پیدا ہوتے رہے۔ ایک روز ایک ہندو پنڈت سے ملنے اس کے گھر گئے۔ وہ ہمارے اس وقت کے جماعت کے صدر کا دوست بھی تھا۔ علیک سلیک کے بعد کافی دیر مذہبی گفتگو ہوتی رہی۔ خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا ذکر آیا تو وہ کہنے لگا ہم ایک سے زیادہ دیوتاؤں پر یقین رکھتے ہیں۔ جب یہ سوال سامنے آیا کہ ایک سے زیادہ دیوتے ماننے کی آخر ضرورت کیا ہے تو پنڈت صاحب کا جواب تھا کہ اگر ایک ہی دیوتا کو مانیں اور وہ کبھی ناراض ہو جائے تو پھر کہاں جائیں گے۔ اس لئے فائدہ ایک سے زیادہ دیوتاؤں کو نہ صرف ماننے میں ہے بلکہ انہیں راضی رکھنے کی کوشش کرنے میں بھی ہے۔ ان کی ناراضگی میں بھی احتیاط رہے گی کیونکہ وہ محسوس کر رہے ہوں گے کہ یہ انسان دوسروں کے پاس چلا جائے گا۔

پنڈت جی کی تاویل سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی دماغ اپنے عقیدے کے صحیح ہونے کے بارے میں قسما قسم کے دلائل اختراع کر لیتا ہے اور اس کے خیال میں وہ دلائل مبنی برصداقت ہوتے ہیں، اس لئے ان کی تردید اس کے خیال میں ممکن نہیں ہوتی اور بسا اوقات اپنی چرب زبانی سے وہ دوسروں کو قائل کرنے میں اور انہیں اپنا ہمنوا بنا لینے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ معاشرے گروہ در گروہ میں تقسیم ہوتے ہیں اور یہی حال مذاہب کا بھی ہے۔ چند افراد معمولی اختلاف کی بنا پر سواد اعظم سے الگ ہو کر ایک علیحدہ گروہ بنا لیتے ہیں اور اپنی اختلافی بات یا مسئلہ کو مبنی برحقیقت ثابت کرنے کے لئے من گھڑت دلائل کا سہارا لیتے ہوئے عوام الناس میں سے بعض کو اپنا ہمنوا بنا لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوۡلِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ
وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ....(4:60)

(ترجمہ)......اور اگر تم کسی معاملہ میں (اولوالامر سے) اختلاف کرو تو ایسے معاملے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دیا کرو اگر (فی الحقیقت) تم اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان لانے والے ہو......'' (4:60)......

اگر اس سنہری اصول پر عمل کیا جائے تو فرقہ بندیاں اور گروہ بندیاں ختم ہو سکتی ہیں۔ فرمان خداوند اور فرمودات نبویؐ میں ہر قسم کے مسائل کے حل موجود ہیں۔ ان پر عمل پیرا ہونے سے ہر قسم کے تنازعات حل ہو سکتے ہیں اور دنیا امن کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ قرآنی تعلیمات تمام دنیا کے لئے ہیں یہ صرف کسی ایک گروہ کے لئے نہیں۔ دنیا کی تمام مخلوق خدا کی مخلوق ہے اور انسان افضل المخلوق ہے۔ خالق کائنات کو انسان کی بہتری مقصود تھی اور اس نے مختلف ادوار میں انسانی معاشرے کی بہتری کے لئے قوانین وقوائد پیغمبروں کے ذریعہ اتارے اور آخری اور اکمل پیغام قرآن کریم کی صورت نازل فرمایا۔ قرآن کریم میں انسانی معاشرہ میں پیدا ہونے والے ہر مسئلے کے لئے اصولی راہنمائی موجود ہے۔ معاشرہ کے حالات میں تبدیلی اور ترقی کے ساتھ جو نئے مسائل جنم لے سکتے تھے ان کے حل کے لئے راہنما اصول مقرر ہیں ان کی روشنی میں نئے نئے پیدا ہونے والے مسائل کا حل نکالا جا سکتا ہے۔

اوپر بیان کردہ ایک مذہب کے راہنما کی اپنے عقیدے کی توجیہہ سے عیاں ہے کہ انسان پہلے ایک معین عقیدہ اپنے لئے تعین کر لیتا ہے اور پھر اس کے صحیح ہونے کے لئے دلائل اپنی طرف سے گھڑتا رہتا ہے۔ سچائی اور حقیقت کی طرف رجوع کرنے کے لئے قطعاً تیار نہیں ہوتا۔ گویا وہ دن کی روشنی دیکھنے کے لئے بھی آنکھیں نہیں کھولتا بلکہ بند کئے ہوئے یہی کہتا چلا جاتا ہے کہ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا۔ جب دلائل سے اس کے عقیدہ کا بطلان ثابت ہو جائے اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑے تو وہ اس بات کا سہارا لیتا ہے کہ وہ تو اپنے اباء واجداد کے مذہب کا پیروکار ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ان کے اس طرز استدلال کا بار بار ذکر کر کے اس کی تردید فرماتا ہے۔ جیسے فرمایا: ''اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ جو اللہ نے اتارا ہے اس کی طرف آؤ تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے اباء اجداد کو پایا۔ کیا اس صورت میں بھی (کافی ہے) کہ ان کے اباء واجداد کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور نہ ہدایت حاصل کرتے تھے۔'' (5:105)۔ پھر فرمایا ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے اتارا ہے تو وہ کہتے ہیں

بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم اپنے اباءواجداد کو پایا۔ کیا ایسی صورت میں بھی (وہ ان کی پیروی کریں گے) جبکہ ان کے باپ دادا کو عقل نہیں رکھتے تھے اور ہدایت یافتہ نہیں تھے۔" (2:171)

15- سورینام کا تیسری مرتبہ دورہ:

سورینام کے دوسرے اور بامقصد دورے سے واپس آئے ایک سال گذر گیا تھا۔ ادھر گی آنا میں تقرری اور وہاں خدمت کرتے ہوئے تین سال کا عرصہ بیت چکا تھا اور تحریک جدید صدر انجمن احمدیہ ربوہ کے قواعد یعنی جس مربی کے اہل وعیال بیرون پاکستان ساتھ نہ گئے ہوں بلکہ وہ پاکستان میں ہوں وہ مربی تین سال کی مفوضہ خدمت کے بعد واپس بلالیا جائے گا۔ لہٰذا اب مجھے تین سال کا عرصۂ خدمت پورا ہونے پر واپس پاکستان روانہ ہونے کے لئے دفتر تبشیر کی طرف سے ارشاد ملنے کا انتظار تھا۔ ادھر سورینام کی جماعت کا اصرار تھا کہ واپس روانگی سے قبل ایک مرتبہ سورینام کا دورہ ضرور کروں اور ان احباب کو مل کر واپس جاؤں جو میرے گی آنا قیام کے دوران سورینام کے دوروں کی وجہ سے، منتشر ہونے کے بعد، ایک مرتبہ پھر تسبیح کے دانوں کی طرح ایک لڑی میں پروئے گئے ہیں۔ چنانچہ ان کے اصرار پر 10 جولائی 1969ء کو تیسری مرتبہ تربیتی، تعلیمی اور تبلیغی دورے پر سورینام کے دارالحکومت پارامار یبو پہنچا۔ چونکہ اب جماعت احمدیہ سورینام منظّم اور فعال ہو چکی تھی اس لئے کثرت سے احباب جماعت استقبال کی غرض سے تشریف لائے ہوئے تھے۔

13 جولائی 1969ء کو افرائم سیخن میں جماعتہائے احمدیہ سورینام کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں سورینام میں قائم تمام جماعتوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ جماعت کی تعلیم وتربیت کو منظّم کرنے اور بہتر طریق پر چلانے کے لئے غور اور مناسب آرا کی روشنی میں فیصلے کئے گئے۔ اسی کانفرنس میں یہ فیصلہ ہوا کہ نونہالان جماعت کو دینی تعلیم کے لئے مدرسہ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ غور اور بحث وتمحیص کے بعد طے پایا کہ احمدیہ بیت الذکر کے لئے مختص جگہ کافی وسیع ہے۔ اس کے ایک طرف مدرسہ کی تعمیر ممکن ہے لہٰذا اسی روز مدرسہ کی تعمیر کے لئے بنیاد رکھی گئی۔

14 جولائی 1969ء کو سورینام کے کثیر الاشاعت اخبار De West کے نمائندے نے "اسلام اور احمدیت" کے موضوع پر میرا انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو میں مقدور بھر پیغام احمدیت کو اجاگر کرنے

کی کوشش کی۔ یہ انٹرویو اگلے روز 15 جولائی 1969ء کو خاکسار کی تصویر کے ساتھ شائع ہوا۔

3 اگست 1969ء کو سورینام ٹیلیویژن کے لئے "میں اسلام کو کیوں مانتا ہوں" کے موضوع پر انگریزی زبان میں تقریر ریکارڈ کرائی۔ اس تقریر کی ریکارڈنگ کے لئے ٹیلیویژن کے نمائندوں نے خاص اہتمام کیا تھا۔ اسی روز دن ڈھلے یہ تقریر خصوصی پروگرام کے طور پر ٹیلی کاسٹ ہوئی۔ یہ تیسرا دورہ کم وبیش ایک ماہ تک جاری رہا اور اس دورے کے نتائج بھی خوش کن رہے۔ سورینام کی جماعت پھر سے تجدید عہد کر کے فعال ہوئی۔ مرکز سلسلہ سے مستقل مربی بھجوانے کی درخواست کی اور چند سال بعد باقاعدہ مرکزی مربی کا تقرر عمل میں آ گیا۔ درحقیقت مشن کے قیام کا آغاز خاکسار کے پہلے دورے یعنی 30 اگست سے ہی عمل میں آ گیا تھا۔ بقیہ دو دوروں میں مشن کے کاموں کو مزید ترقی دینے کا کام ہوا۔ جماعت کے حوصلے بڑھے جماعت کی افرادی قوت میں اضافہ ہوا۔ احمدیہ تحریک کے اغراض ومقاصد جماعت کے افراد کے لئے خصوصًا اور ملک کے عوام کے لئے عمومًا نمایاں ہو کر سامنے آئے۔

Maulana Ghulam Ahmad Naseem op bezeok

Mometeel brengt de maulana Ghulam Ahmda Naseem, verbonden aan de Ahmaduyya Mission of Guyana, een werkbezoek, dat ..gerveer een maand zal duren, aan ons land De 'heer Gulam Ahmad Naseem die enkele dagen geleden in Suriname arreiveede verblijft momenteel te Aphraim's Zegen no. 26, Het doel van het bezoek aan Suriname is om, evenals zulks bijvorige geleginhe n het geval is geweest, zoveel mogelijk de aandacht te vestigen of de Islam.

De maulana zal daarom vergaderingen voorlichtingsb.. eenkomstenen onderrichtingssamenkomsten houden om aan het doel te kunnen werken.

Men onderzoekt de mogeijkgeden ook bijeenkomsten te houden waarin de maulana zijn gehoor in get Engles zal kunnen toespreken.

In de eerste plaats omdat men het van betekenis acht, dat ook anderen, die de niet Islamitische godsdienst belijden, dan meer te weten komen van de Islam, dan men normaal aangebo den kan krijgen. De hr, Naseem vertoeftthans voor de derde keer in Suriname. Hij bezocht Twaalf jaar geleden begon hij eerste arbeidsveld buiten Pakistan lag in Sierra Leone (Afrika), waar hij

vier jaar raibische gebied, met standplaats Guyana, volgde in 1966.
De heer Naseem Spreekt vujf talen.

(De West 15 July 1969)

متفرق واقعات:

سورنیام کی ایک معمر خاتون جو پہلے انجمن اشاعت اسلام لاہور سے تعلق رکھتی تھی نے بیان کیا کہ وہاں قائم جماعت کی تعلیم وتربیت اور نئی نسل کو اسلامی تعلیم سے بہرہ ور کرنے کے لئے انہوں نے جماعت لاہور کے امیر کو لکھا کہ کوئی ٹرینڈ مبلغ بھجوائیں تا وہاں تعلیم وارشاد کا کام احسن طریق سے انجام پا سکے۔ ان کی طرف سے جواب آیا کہ مبلغ ہماری دی ہوئی تعلیم وتربیت سے نہیں بنتا بلکہ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی تربیت سے بنتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مبلغ ہم نہیں بناتے بلکہ خدا بناتا ہے۔ اس جواب نے ہمیں پریشان کر دیا کیونکہ ہم نے بارہا سنا تھا کہ جماعت احمدیہ نے دنیا کے مختلف ممالک میں تبلیغی اور تربیتی مراکز قائم کر رکھے ہیں جو دن رات دعوت الی اللہ کا کام کرتے ہیں اور جماعت کے افراد کی تعلیم وتربیت کا کام بھی دن رات ہوتا ہے۔ مزید تحقیق اور جستجو کرنے پر معلوم ہوا کہ جو جماعت دنیا بھر میں تبلیغی مراکز اور مشن قائم کئے ہوئے ہے اور مزید قائم کر رہی ہے وہ ایک منتخب خلیفہ کی ہدایات کی پابند اور ماتحتی میں کام کرتی ہے اور اس جماعت کا مرکز قادیان تھا اور خلیفہ وقت بھی وہیں قیام پذیر تھے گو قادیان اب بھی مرکز ہے لیکن برصغیر کی تقسیم کے بعد اس مرکز کا بیشتر حصہ اور اہم دفاتر اب ربوہ، پاکستان میں قائم ہیں۔ خلیفہ وقت بھی ربوہ میں قیام پذیر ہیں۔ چنانچہ ہم نے کسی نہ کسی طرح مرکز ربوہ کا ڈاک کا پتہ حاصل کر کے مبلغ بھجوانے کے لئے لکھا ہماری درخواست کے کچھ عرصہ بعد مرکز ربوہ نے جماعت کی تعلیم وتربیت کے لئے ایک مرکزی مبلغ بھیج دیا۔ اور ہمیں بے انتہا خوشی ہوئی خصوصاً اس وجہ سے کہ اب ہماری اگلی نسل صحیح اسلامی تعلیم سے بہرہ ور ہو سکے گی۔

یہاں اس بات کا ذکر بے سود نہ ہوگا کہ سورینام کی آبادی کا تقریباً نصف حصہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو غلامی کا دور ختم ہونے کے بعد برصغیر سے آبادکار بھرتی کر کے لائے تھے۔ آبادکاران لوگوں سے کھیتی باڑی کا کام کرواتے تھے خصوصاً گنا اگانے اور اس کی پرداخت اور پھر اسے کارخانوں تک پہنچانے تک کا کام ان کے سپرد ہوتا تھا۔ ان کی مدت ملازمت پانچ سال مقرر ہوتی تھی۔ پانچ سال پورے کرنے پر انہیں اختیار دیا جاتا تھا کہ خواہ وہیں آباد ہو جائیں یا واپس انڈیا چلے جائیں۔ پانچ سال کے عرصہ کی جمع شدہ رقم

یکمشت ادا کر دی جاتی تھی۔ 1967ء میں جب میں وہاں گیا تو ان لوگوں میں سے جو براہِ راست بھرتی ہو کر گئے تھے خال خال باقی تھے ان میں سے ایک آدھ مجھے ملنے بھی آئے۔ حتی کہ ان میں سے ایک عمر رسیدہ بزرگ نے کلکتہ سے سورینام پہنچنے کی بڑی سبق آموز کہانی سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ گھر سے کسی رنجش کی بنا پر نکل آئے۔ ان کی عمر 14، 15 سال ہوگی۔ وہ سڑک پر رواں دواں تھے کہ کسی نے انہیں آواز دے کر اپنے پاس بلایا اور کہا مکہ چلو گے۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے کہ مکہ شریف کون مسلمان جانے سے خوش نہ ہوا اور زہے قسمت کہ یہ شخص مجھے مکہ جانے کی دعوت دے رہا ہے۔ میری حامی بھرنے پر وہ مجھے اپنے ساتھ ایک دفتر لے گیا اور پھر چند دن بعد ایک بادبانی جہاز پر روانہ ہوا۔ چھ ماہ یا اس سے کم وبیش سفر کے بعد پیرامار یبو جہاز لنگر انداز ہوا تو دیکھتا ہوں کہ سرسبز علاقہ ہے جبکہ سن رکھا تھا کہ مکہ شریف کے اردگرد خشک پہاڑ ہیں۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ یہاں عارضی قیام ہے۔ اس کے بعد منزل مقصود آئے گی۔ چنانچہ وہاں سے ایک ایسے گنہ کے کھیت میں بھجوایا گیا جسے سرا مکہ کا نام دیا گیا تھا۔ گویا لیبر بھرتی کرنے والوں نے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر کے مزدوروں کو ان دور دراز ملکوں میں بھجوایا۔

وہ لوگ جو براہ راست گئے انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے مذہب اور تہذیب کو قائم رکھا۔ اب ان کی اگلی پود تھی اور ان کی اگلی نسل تھی جو اس وقت تعلیم وتربیت کی خاص طور پر محتاج تھی۔ جو لوگ براہ راست انڈیا سے وہاں گئے انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنی تہذیب تمدن اور مذہب کو قائم رکھا۔ پھر انہوں نے بچوں کی تربیت میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اور اس طرح زبان اور تہذیب سے کسی قدر لگاؤ رہا لیکن تیسری نسل وہاں کے ماحول سے شدید متاثر تھی۔ ان کی تعلیم وتربیت کسی خاص انتظام کے بغیر انہیں بہت مشکل ہو رہی تھی۔ اس بارے میں بزرگ خاصے متفکر تھے سورینام کی باقی نصف یا کچھ زیادہ آبادی افریقن غلاموں کی اولاد ہیں یا کچھ قدیم باشندے ہیں۔ افریقنوں نے مغربی تہذیب پوری طرح اپنا لی ہے اور مذہباً ان کی اکثریت عیسائی ہے۔ یورپ کی قوموں کے سورینام پہنچنے سے قبل کے باشندے بھی کہیں کہیں ملتے ہیں لیکن بہت کم اور دور دراز کے علاقوں میں رہتے ہیں۔ انہیں وہاں امریکن انڈین (امرانڈین) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

باب پنجم

زیمبیا Zambia

مختصر حالات:

زیمبیا جنوبی وسطی افریقہ میں واقع لینڈ لاکڈ (Landlocked) ملک ہے۔ دریائے زیمبیزی جو ملک کے جنوبی حصہ کی زیادہ تر سرحد متعین کرتا ہے کی مناسبت سے ملک کا نام زیمبیا رکھا گیا ہے۔ وکٹوریا آبشار جو دنیا کی چند مشہور آبشاروں میں شمار ہوتی ہے اسی دریا پر واقعہ ہے۔

زیمبیا آزاد ہونے سے قبل برطانیہ کی نوآبادیات میں شامل تھا اور شمالی رہوڈیشیا کے نام سے مشہور تھا اور رہوڈیشیا اتحاد کا حصہ تھا۔ اس اتحاد میں زیمبیا کے علاوہ نیاسالینڈ جواب ملاوی ہے اور جنوبی رہوڈیشیا جواب زیمبابوے ہے شامل تھے۔ زیمبیا 1964ء میں آزاد ہوا اور جمہوریہ زیمبیا کے نام سے متعارف ہوا۔ اس کا کل رقبہ 290586 مربعہ میل ہے۔ دارالحکومت لوساکا (Lusaka) ہے جو مقام وقوع اور جدید طرز تعمیر کی وجہ سے بہت مشہور ہے اور نہایت خوبصورت ہے۔ ملک کی معدنیات میں تانبہ شامل ہے جو بکثرت پایا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے یہ ملک دنیا کے چندان ممالک میں شمار ہوتا ہے جو تانبے کی پیداوار میں سرفہرست ہیں۔ ملک کی اقتصادیات کا زیادہ تر انحصار اسی پر ہے اسی بنا پر یہ ملک افریقہ کے چند متمول ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔

آبادی:

زیمبیا کے باشندے افریقن ہیں جو بانتو (Bantu) زبان بولنے والے قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ زیمبیا میں 70 قبائل آباد ہیں اور اتنی ہی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں البتہ ان میں سے آٹھ ایسی زبانیں

ہیں جو عام بولی اور سمجھی جاتی ہیں اور سکولوں میں بمطابق علاقائی ہونے کے پڑھائی بھی جاتی ہیں۔ بہت سے لوگ انگریزی زبان بھی بولتے ہیں جو وہاں کی سرکاری زبان ہے۔ دیہات کے باشندوں کی طرزِ معاشرت اب بھی زمانہ قدیم جیسی ہی ہے۔

مذہب:

آبادی کا اکثر حصہ عیسائیت کا پیروکار ہے۔ تاہم دیہات اور ملک کے دور دراز علاقوں میں روائتی عقائد و اعتقادات پر بھی لوگ قائم ہیں ملک کے بعض حصوں میں خصوصاً جو حصے سرحد ملاوی اور تنزانیہ کے ساتھ ملحق ہیں ان میں مسلمان بھی ہیں لیکن بہت کم تعداد میں۔

زیمبیا کے لئے تقرری اور روانگی:

گی آنا میں قریباً سوا چار سال کی خدمت دین اور دعوت الی اللہ کے بعد 8 اگست 1970ء کو مرکز ربوہ میں واپسی پر جامعہ احمدیہ میں تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دینے کا ارشاد ہوا اور یہ فرائض قریباً پانچ سال تک جاری رہے۔ اس دوران تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ بعض دیگر جماعتی کاموں میں بھی حصہ لیتا رہا۔ پاکستان کے مختلف اضلاع میں انصار اللہ کی طرف سے منعقدہ اجلاسوں میں مرکز کی نمائندگی کے فرائض بھی انجام دینے کی توفیق ملتی رہی۔ سن ستر کی دھائی میں جامعہ احمدیہ میں پاکستان کے علاوہ دیگر ممالک کے طلباء بھی دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخلہ لیا کرتے تھے اور انہیں ابتدائی اردو زبان سکھانے کے لئے ایسے اساتذہ کی ضرورت ہوتی تھی جو ان کی راہنمائی کر سکیں۔ چنانچہ میرے سپرد اکثر ایسے ہی طلباء کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ یہ فرائض پانچ سال جاری رہے اور پھر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے 'زیمبیا' وسطی افریقہ جانے کا ارشاد فرمایا۔ چند دن کی تیاری کے بعد زیمبیا روانہ ہوا۔

2- زیمبیا مشن کے ابتدائی حالات کا مختصر ذکر:

15 اکتوبر 1975ء کو کراچی سے لوساکا (Lusaka) پہنچا۔ زیمبیا کے مربی انچارج مکرم شیخ نصیر الدین صاحب نے لوساکا شہر کے ایک ہوسٹل میں قیام کا انتظام کیا۔ یہ ہوسٹل محکمہ تعلیم حکومت زیمبیا کے زیر انتظام تھا اور اس میں ملک کے طول و عرض میں کام کرنے والے اساتذہ جو دارالحکومت میں کسی کام

کے سلسلہ میں آتے قیام پذیر ہوتے۔ چند دن قیام کرتے اور پھر اپنی اپنی قیام گاہوں کو روانہ ہو جاتے۔ مجھے مربی صاحب اور زیمبیا جماعت کی طرف سے وہاں ٹھہرائے جانے پر خوشگوار حیرت ہوئی۔ کیونکہ عموماً طریق یہ ہوتا تھا کہ نئے آنے والے مربی کو مشن ہاؤس میں پہلے سے وہاں موجود مربی کے پاس ہی قیام کا انتظام ہوا کرتا تھا۔ اور پہلے سے موجود مربی اسے اپنے لئے اعزاز تصور کرتا اور مرکز سلسلہ سے نئے آنے والے مربی کو خوش آمدید کہنے کے ساتھ ساتھ مرکز کے اور وطن کے حالات بھی معلوم کرتا اور وہاں کے ملکی حالات، اس ملک میں جماعت کے حالات اور دعوت الی اللہ کے مواقع سے آگاہ کرتا۔ لیکن ایسا اس مرتبہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر مجھے بجا طور پر حیرت تھی۔ تاہم مربی انچارج اور ایک دوسرے احمدی دوست مجھے ہوسٹل میں چھوڑ کر چلے گئے اور مَیں اس سوچ میں ڈوب گیا کہ ایسا آخر کیوں کیا گیا ہے۔ رات جوں توں بسر ہوئی۔ صبح دس بجے تک انتظار کیا۔ لیکن کسی قسم کا رابطہ نہ ہوا۔ ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر شہر کے مرکزی حصہ جسے وہاں ڈاؤن ٹاؤن (Down Town) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کا رخ کیا۔ میل بھر چلنے کے بعد شہر کے مرکزی حصہ میں پہنچا۔ مشن کے دفتر کا پتہ chachach روڈ پر تھا۔ یہ شہر کی مشہور شاہ راہ ہے۔ یہ سڑک جب مجھے نظر آئی تو بہت خوشی ہوئی اور اس پر میں جنوب کی سمت چل پڑا۔ شاہ راہ ختم ہونے کے قریب تھی کہ ''احمدیہ مسلم مشن'' کا بورڈ نظر آیا تو بے حد خوشی ہوئی۔ گھنٹی بجانے پر مربی صاحب تشریف لائے اور حیران ہوئے کہ کیسے پہنچ گیا ہوں۔ اندر گیا تو دیکھا کہ ایک چھوٹا سا کمرہ ہے اور اس میں مشن کا دفتر ہے اور کچھ کتب وغیرہ ہیں۔ یہ کمرہ ایک بڑی عمارت کا حصہ ہے اس کے پیچھے اور عمارت کے بغل میں خالی لیکن پختہ جگہ ہے۔ اس جگہ کے ایک حصہ پر ٹین کی چھت ہے۔ اس چھت کے آخری نصف حصہ میں مربی صاحب موصوف نے ہارڈ بورڈ کی دیوار بنا کر اسے کمرے کی شکل دے کر رہائش رکھی ہوئی ہے۔ اور ساتھ ہی چھوٹا سا کچن بنایا ہوا ہے اور یہ کل مشن کی کائنات ہے۔

مربی صاحب نے مجھے دیکھ کر کہ ہوسٹل سے پا پیادہ یہاں تک کیسے پہنچا ہوں اور پھر دفتر کو تلاش بھی کر لیا ہے۔ خوش آمدید کہنے اور علیک سلیک کے بعد سلسلہ گفتگو شروع ہوا تو ایسے حالات اور کسمپرسی کی حالت میں مشن کے گونہ گوں کام چلانے کا ذکر چل پڑا۔ کہنے لگے اس سے بھی بدتر حالات میں سے گذرنا پڑا اور قیام رہا۔ قریب ہی ایک گاؤں جس کا نام چھبولیا ہے۔ وہاں ایک افریقن احمدی کے ہاں قیام رہا۔ مقصد یہ تھا کہ مشن کو ہر حال میں جاری رکھنا ہے۔ بلند مقصد کے حصول کے لئے قربانیاں دینی ہی پڑتی

ہیں۔ مشن کے مالی حالات اجازت نہیں دیتے تھے کہ کسی بہتر جگہ کا انتظام کیا جا سکے۔ فنڈز محدود تھے اور ان کے اندر رہتے ہوئے ہی کام چلانا تھا۔ کرایہ کی مد میں اتنی رقم نہ تھی کہ کوئی اچھا مکان رہائش اور دفتر کے لئے لیا جاتا۔ کرایہ کے لئے بجٹ میں مختص رقم سے اسی قسم کی جگہ حاصل کی جا سکتی تھی۔ جس میں اس وقت ہم بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس جائزے اور گفتگو سے یہ عقدہ حل ہوا کہ ہوسٹل میں قیام کا انتظام کیوں کیا گیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں عرض گذار ہوا کہ میں بھی یہاں ہی آپ کے پاس آ جاتا ہوں۔ فرمانے لگے اول تو یہاں پر بیڈ نہیں ہے اور اگر بیڈ کا انتظام کر بھی لیا جائے تو بچھانے کیلئے جگہ نہیں ہے۔ ہیوبرٹ ینگ ہوسٹل میں ہی قیام ٹھیک ہے کیونکہ کمرے کا کرایہ مناسب ہے۔ چند دنوں تک میری روانگی ہوگی اور پھر آپ یہاں چلے آئیں۔ چنانچہ دوپہر ڈھلے واپس ہوسٹل چلا گیا۔ رات کافی کرب میں بسر ہوئی ہوسٹل میں ہر قسم کے لوگ آتے۔ اپنے طریق پر رات بسر کرتے اور چلے جاتے۔ طبیعت میں بے سکونی سی رہتی۔ نہ عبادت کیلئے جگہ اور نہ ہی سکون کا مقام۔ چھوٹا سا کمرہ اور پھر آس پاس کمرے جہاں مہمان آتے اور وہاں کے انداز کے مطابق شغل اشغال میں مشغول رہتے پھر روانہ ہو جاتے اور ان کی جگہ دوسرے آ جاتے۔ ایک روز مَیں کھانے کے ہال میں گیا واپس آیا تو کمرہ کھلا ہوا پایا۔ باقی چیزیں تو ویسے ہی تھیں لیکن کوٹ جو کمرے میں لٹک رہا تھا اس کی جیب میں جو چند ڈالر تھے وہ غائب ہو چکے تھے۔

تین چار دن کے ہوسٹل کے قیام کے دوران اندازہ ہو گیا کہ کس قسم کے حالات سے دوچار ہوں۔ دن کو مربی صاحب کے پاس چلا جاتا۔ کبھی شام کے وقت وہ ہوسٹل آ جاتے۔ دفتر اور رہائش کے لئے کسی بہتر اور مناسب جگہ کے حصول کے لئے جائزہ سے معلوم ہوا کہ مقررہ مشن کا بجٹ جو سال بھر کے لئے ہوتا ہے اس میں کسی مناسب مکان کا ملنا محال ہے۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو مربی صاحب نے کبھی کا اس کا انتظام کیا ہوتا۔ ان کی قربانی کی داد دینی چاہئے کہ وہ ہر حال میں زیمبیا میں دعوت الی اللہ کے کام کو جاری رکھنے کی دھن میں مستقل مزاجی سے خراب سے خراب حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اس نیک کام میں مشغول رہے۔

لوساکا میں مکانوں کے کرائے اتنے زیادہ تھے کہ کسی پرائیویٹ مکان کا کرایہ پر حصول کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ملک کی کرنسی کا ریٹ اور مارکیٹ ریٹ میں ایک اور پانچ کی نسبت تھی اور مکانوں کے مالک مارکیٹ ریٹ پر کرایہ مانگتے تھے جبکہ ہمارا مشن ابھی تک بیرونی مدد سے چل رہا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ انگلینڈ سے اگر یکصد پونڈ بذریعہ بنک زیمبیا بھجوائے جاتے تو قریباً یکصد پندرہ یا بیس

کواچے (کواچہ زیمبیا کی کرانی) ملتے تھے۔لیکن وہاں کے اس وقت کے مارکیٹ ریٹ کے حساب سے قریبًا پانچ صد کواچے بنتے تھے۔لوساکا میں اس قت سکنی جائیدادیں مکان وغیرہ زیادہ تر غیر مقامی لوگوں کی تھیں اس لئے وہ اسی حساب سے کرایہ متعین کرتے تھے اور مقامی باشندے بھی اس سے متاثر تھے۔

بہر کیف شیخ صاحب کے ساتھ چند دن اسی طرح قیام رہا اور ہوسٹل کے حالات بھی جوں کے توں تھے۔کبھی طبیعت میں شدید گھبراہٹ ہوتی۔چونکہ زیمبیا مشن نیا نیا قائم ہوا تھا۔جماعت کے چند ہی افراد تھے اور ان میں سے زیادہ تر کا تعلق پاکستان یا کسی اور ملک سے تھا یہ لوگ تین سال کے معاہدہ ملازمت پر وہاں آتے اور معاہدہ کی میعاد ختم ہونے پر تجدید نہ ہونے کی صورت میں اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلے جاتے۔ جماعت کے مقامی افراد چند ایک ہی تھے اور جو تھے بھی ان کے وسائل بہت محدود تھے اور اثر و رسوخ نہ ہونے کے برابر تھا۔ان حالات سے دوچار ہونے کی وجہ سے شدید پریشانی لاحق ہوئی۔اور قسما قسم کے وساوس نے گھیر لیا۔خیال پیدا ہوا کہ ان حالات میں یکسوئی سے کام کرنا نہایت ہی مشکل ہے۔اور یوں ہی وقت اور چندوں سے حاصل کردہ رقم کا ضیاع ہے۔واپسی کا ٹکٹ موجود ہے مرکز کو تمام حالات سے آگاہ کرتے ہوئے اجازت لے کر واپس چلا جاؤں۔جب اس خیال نے زور پکڑا تو استخارہ کرنے کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ لیکن جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ کمرہ میں نماز ادا کرنے کی جگہ نہ تھی تاہم جو بھی میسر تھی وہیں نماز ادا کی استخارہ کیا لیکن کوئی اشارہ نہ ملا۔اگلے روز بھی ایسا ہی کیا مگر پھر بھی نہ کوئی اشارہ ملا اور نہ ہی دل کی تسلی ہوئی۔

قرآن مجید کی آیت سے فال:

بالآخر دل نے یہ فیصلہ کیا صبح کی نماز کی ادائیگی کے بعد قرآن مجید تلاوت کی نیت سے جب کھولا جائے اور جس آیت پر سب سے پہلے نظر پڑے اور جو مضمون اس آیت کا ہو اس پر عمل کیا جائے۔گویا دل کو بہلانے کے لئے یہ خیال اچھا ہے یا دل کو خوش رکھنے کے لئے یہ خیال اچھا ہے۔ساتھ ہی یہ بھی دل سے وعدہ ہوا کہ روزانہ تلاوت کے لئے جو نشانی رکھی ہوئی ہے اس جگہ کو نہیں بلکہ قرآن مجید کو ہاتھ میں لیتے ہی دفعۃً کھولا جائے۔لہٰذا اس خیال کو بروئے کار لاتے ہوئے قرآن مجید جب کھولا تو سورۃ الفتح کی اس آیت پر نظر پڑی:

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَأْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ...... (48:21)

ترجمہ:''اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جو تم اپنے قبضہ میں لاؤ گے اور یہ تم کو جلدی عطا کر دیا ہے......''اس آیت پر نظر پڑی تو پھر دیر تک اس آیت کریمہ پر نظریں جمی رہیں۔گہری سوچ میں

کچھ دیر ڈوبے رہنے کے بعد دل کو اطمینان اور تسلی نصیب ہوئی اور طبیعت پُر سکون ہوگئی۔اور پھر دل خدا تعالیٰ کی حمد سے لبریز ہو کر اس کی قدرتِ بے کراں کے ترانے گانے لگا۔اسی وقت قرآن مجید کے نسخہ کے اس صفحہ کے حاشیہ پر تاریخ لکھی جو 29 اکتوبر 1975ء تھی اور ساتھ ہی لوساکا (Lusaka) بھی تحریر کیا۔قرآن مجید کا یہ نسخہ میرے لئے حرزِ جان ثابت ہوا اور بعد ازاں میری زندگی کا حصہ بن گیا اور جہاں بھی گیا اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔

اس طرح اطمینان قلب نصیب ہونے پر اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا۔ہوسٹل کے قیام کے دوران وہاں قیام پذیر اور ملنے والوں سے آغاز ہوا۔ان میں سے بعض کو اسلام کا پیغام دینا شروع کیا۔یاد رہے کہ وسطی افریقہ جس میں زیمبیا بھی شامل ہے میں مسلمان بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔اور مسلمانوں کو وہاں بدنام زمانہ غلاموں کی تجارت کے تاجر تصور کیا جاتا اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ یورپ کے تاجروں کے ہاتھوں افریقنوں کو بطور غلام بیچتے رہے ہیں۔بلکہ زیمبیا میں ایک مقام ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں یہ تاجر باہمی لین دین کیا کرتے تھے۔افریقہ کے اس وسیع حصہ میں جو قبائل آباد ہیں ان کا زیادہ تر تعلق روایتی مذاہب سے ہے۔جن باشندوں نے عیسائی سکولوں میں تعلیم حاصل کی وہ عیسائیت سے متعارف ہوئے کیونکہ عیسائی سکول چرچوں کے تھے اور ان میں مذہبی تعلیم نصاب کا حصہ تھی اور ہر طالبعلم کے لئے پاس ہونے کے لئے لازمی طور پر مذہبی تعلیم حاصل کرنی پڑتی تھی۔چرچوں کے عیسائی سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بعض افراد عیسائی ہو جاتے لیکن سب کے سب عیسائیت قبول نہ کرتے جیسا کہ افریقہ کے بعض دیگر علاقوں میں ہوا۔اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ یہ قبائل جن میں بنٹو (Buntu) قبیلہ اور اس کی شاخیں شامل ہیں کسی زمانہ میں حکمران رہے ہیں۔

زیمبیا کے لوگوں سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔جس سے بھی ملاقات ہوتی تعارف ہوتے ہی زیمبیا آنے کے مقصد کا ذکر ہوتا اور پھر دعوتِ حق کی بات ہونے کا عمل شروع ہو جاتا۔صبح ہوسٹل سے مشن کے دفتر میں حاضر ہو جاتا۔ایک روز شیخ صاحب سے اصرار کیا کہ میں بھی یہاں دفتر میں ہی آجاتا ہوں جیسے عسر و یسر میں آپ رہ رہے ہیں میں بھی رہ لوں گا۔کچھ ردوکد کے بعد وہ مان گئے کہ ٹھیک ہے خوب گذرے گی جب مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔پھر جب تک ان کا قیام زیمبیا میں رہا ان کے ساتھ ہی میرا قیام بھی رہا۔اسی دوران زیمبیا کے چند ایک دیگر شہروں میں جہاں جماعت تھی وہاں بھی گئے۔جہاں بھی جاتے شیخ صاحب

خاکسار کا نئے مربی انچارج کے طور پر تعارف کراتے اور کہ وہ جلد زیمبیا کو الوداع کہنے والے ہیں۔

5 نومبر 1975ء کو شیخ صاحب پاکستان روانہ ہو گئے۔ میل ملاقات اور پھر جدائی۔ خصوصاً جدائی کے لمحات بڑے رقت آمیز ہوتے ہیں اور پھر جدائی بھی وطن سے دور دو ہموطنوں کا ایک دوسرے کو الوداع کہنا جذباتی روپ دھار لیتا ہے۔ روانگی کے وقت بغلگیر ہونے کے بعد۔ میں نے کہا۔ شیخ صاحب آپ اداس کر چلے ہیں۔ گلوگیر آواز میں فرمایا۔ یہی دستور دنیا ہے۔ غم غلط کرنے کی خاطر عرض کیا۔ ''ہو سکے تو لوٹ آنا۔'' انہوں نے مسکراہٹ کے سوا کوئی جواب نہ دیا۔ مشن کا چارج لینے کے بعد کام شروع کیا۔ دعوت حق کا کام اور طریق ہر ملک اور علاقہ اور وہاں کے حالات کے مطابق کرنا ہوتا ہے۔ چند ایام جو شیخ صاحب کے ساتھ گذارے اس سے کافی حد تک ملکی حالات سے واقفیت ہوئی تھی۔ لیکن ابھی پورے حالات کا جائزہ لینا باقی تھا تاہم دعوت کا کام روائتی طریق پر شروع کیا۔ انفرادی رابطوں کے علاوہ اجتماعی رابطوں کی کوشش کی۔ سکولوں اور کالجوں سے رابطے کئے جاتے۔ کبھی کبھار کسی سکول یا کالج میں ...... پندرہ بیس منٹ یا زیادہ سے زیادہ نصف گھنٹہ تقریر کرنے کے لئے مل جاتا۔ ہفتہ وار رخصتوں اور دیگر رخصت کے ایام میں جماعتی تربیت کے لئے اجتماعات منعقد ہوتے۔ ان اجتماعات میں غیر از جماعت افراد کو شامل کرنے کی پوری کوشش کی جاتی۔ ملک کے طول و عرض میں دورے کر کے پیغام حق پہنچانے کی تگ و دو بھی ہوتی۔

3- مشن ہاؤس کے لئے موزوں مکان کی تلاش:

روز مرہ کے مفروضہ کاموں کے ساتھ ساتھ مشن کے لئے کسی موزوں جگہ کی تلاش بھی شروع کر دی۔ لیکن جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ منظور شدہ بجٹ کے اندر کسی مناسب جگہ مکان کا حصول ناممکن تھا۔ تاہم تگ و دو جاری رہی۔ جس جگہ رہائش تھی وہ صحت کے نکتہ نظر سے نہایت ہی غیر موزوں تھی خصوصاً برسات کے موسم میں وہاں قیام گویا بیماری کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ جماعت کی ماہانہ اور دیگر موقعوں کی مجالس میں یہ بات زیر بحث آتی۔ ایک مرتبہ جب یہ مسئلہ زیر غور آیا تو مجلس عاملہ کے ممبران نے رہائش کی جگہ کا معائنہ کیا اور صحت کے لئے غیر مناسب قرار دیتے ہوئے فیصلہ کیا کہ جب تک کوئی مستقبل انتظام نہیں ہوتا مجلس عاملہ کا ہر ممبر اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لاتے ہوئے فی الحال عارضی طور پر مربی کی رہائش کے لئے کوشش کرے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ڈاکٹر محمد افضل صاحب نے اپنا کردار ادا کیا۔ ان کے ملنے والوں میں سے ایک فیملی جو کنٹریکٹ پہ حکومت زیمبیا کی ملازم تھی۔ ان کے مدت معاہدہ کی تین سال کے لئے مزید

تجدید ہو گئی اور وہ چار ماہ کی رخصتیں گذارنے اپنے وطن جانے والے تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان سے میرے لئے ان کے مکان میں رہائش رکھنے کی حفاظت کی درخواست کی اور انہیں مکان کی حفاظت اور اشیاء کی حفاظت کا یقین دلایا تو وہ مان گئے اور اس طرح برسات کے چارہ ماہ کے لئے رہائش کا عارضی انتظام ہو گیا۔ اور پھر یہ عرصہ ختم ہونے پر ان ہی کی کوشش سے ایک اور جگہ اسی قسم کا انتظام ہو گیا۔ اس سارے عرصہ میں مستقل رہائش کے لئے مکان کی تلاش برابر جاری رہی۔ مثل مشہور ہے تلاش سے خدا تعالیٰ بھی مل جاتا ہے۔ جویندہ یابندہ بھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ کے فضل اور اس کے حضور مسلسل دعاؤں اور پوری کوشش سے یہ بات درست ثابت ہوئی۔ مشن کو جس بجٹ کے اندر رہتے ہوئے جس قسم کے موزوں مکان کی تلاش تھی بالآخر ایسا مکان میسر آ ہی گیا۔ یہ ایک لمبی داستان ہے مختصر یہ کہ لوساکا شہر کے مضافاتی حصہ میں حکومت کا ایک ذیلی ادارہ ان دنوں ایک سکیم کے تحت کم آمد والے لوگوں کے لئے مکان تعمیر کر کے انہیں کرایہ پر مہیا کرتا تھا۔ اس ادارے کے دفتر کو مشن نے مکان کے لئے درخواست دے رکھی تھی۔ لیکن یہ ادارہ ہمیں کم آمدنی والوں میں شمار کرنے سے بدیں وجہ ہچکچاتا تھا کہ مشن غریب نہیں ہوتے۔ غالباً ان کے ذہن میں عیسائی مشن کا تصور تھا۔ جب بھی مینجر سے ملاقات ہوتی وہ یہی کہتا کہ مشن کم آمدنی والوں میں شمار نہیں ہوتے اور نہ ہی مشنری کم آمدنی والوں کی تعریف میں آتا ہے۔

جمعہ کی نماز مشن کے دفتر کے باہر موجود شیڈ میں ہی ادا کی جاتی تھی۔ ایک جمعہ کی نماز میں دعاء کی تحریک کی اور یہ بھی وضاحت کی کہ احمدیہ مشنوں کی عالمی حیثیت کے بیش نظر زیمبیا مشن کے لئے یہ جگہ موزوں نہیں ہے۔ کوشش بسیار کے باوجود ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی احباب دعا کریں کوئی بہتر اور موزوں جگہ میسر آ جائے۔ احباب نے پرسوز دعائیں کیں۔ نماز کی ادائیگی کے بعد نمازی رخصت ہو گئے لیکن ایک نوجوان طالبعلم بیٹھے رہے۔ گفتگو کا آغاز ہوا تو انہوں نے دریافت کیا کہ لوساکا ہاؤسنگ اتھارٹی میں دی گی درخواست کا کیا بنا۔ عرض کی کہ چند ہفتوں سے سائٹ مینجر صاحب رخصت پر تھے۔ رابطہ نہیں ہو سکا نہ جانے اب بھی واپس آئے ہیں کہ نہیں۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ ابھی ان کے دفتر میں چلتے ہیں۔ جب دفتر پہنچے تو وہ غیر متوقعہ طور پر دفتر میں موجود تھے۔ علیک سلیک کے بعد دریافت کیا کہ گذشتہ چند دنوں سے آپ دفتر نہیں آئے خیرت تو تھی۔ کہنے لگے مکان بنوا رہا تھا اس لئے رخصت لی ہوئی تھی۔ میرے ساتھ اس وقت کے قابل احترام طالب علم جن کا نام شبیر احمد بھٹی مجھے یاد ہے اور جنہوں نے بعد میں ڈاکٹر شبیر احمد بھٹی کے

نام سے بہت شہرت حاصل کی۔ انہوں نے سائٹ مینجر سے پوچھا کہ کیا مکان کی تعمیر مکمل ہوگئی ہے انہوں نے جواب میں کہا کہ چھت تک پہنچے اور رقم ختم ہوگئی لہٰذا چھت ڈالنا ابھی باقی ہے۔ اس گفتگو کے دوران دونوں ایک دوسرے کوغور سے دیکھتے رہے۔ اور پھر یوں گویا ہوئے کہ ہم نے کہیں ایک دوسرے کو دیکھا ہے یوں لگتا ہے کہ شناسا ہیں۔ اس پر مینجر نے پوچھا کہ آپ کہاں ہوتے ہیں۔ کہنے لگے لوسا کا یونیورسٹی کیمپس میں ہوں اور میڈیکل کے آخری سال میں ہوں۔ کیمپس میں داخلہ کے ذکر سے سارا مسئلہ حل ہوگیا۔ کیونکہ جس سال شبیر احمد صاحب نے داخلہ لیا وہ ان کا کیمپس میں آخری سال تھا۔

اس مختصر تعارف سے اجنبیت کسی قدر دور ہوگئی اور دوستانہ رنگ میں گفتگو کا آغاز ہوا۔ مکرم شبیر احمد صاحب نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے انہیں بتایا کہ ہمارا مشن اس ملک میں نیا ہے اور کہ مشن کا مقصد خدمت خلق ہے اور اپنے وسائل کے اندر رہتے ہوئے خدمت خلق اور مذہبی کام چلاتا ہے۔ لہٰذا آپ کے تعاون کی اشد ضرورت ہے۔ تاہم انہوں نے اصرار نہ کیا اور گفتگو اور ملاقات کا وقت ختم ہوتے ہی جب ہم دفتر سے باہر نکلے تو زیادہ پر امید نہ تھے۔ لیکن جمعہ کے دن کی دعائیں اور التجائیں رنگ لائیں اور اگلے ہی روز صبح دس بجے فون پر مینجر صاحب نے اطلاع دی کہ ہاؤسنگ سوسائٹی میں مکان نمبر 0909 آپ کی درخواست پر احمدیہ مشن آف زیمبیا کو الاٹ کر دیا گیا۔ آپ دفتری اوقات میں کسی وقت آ کر دفتر سے چابی حاصل کرلیں۔ اس اطلاع سے جس قدر مسرت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد کے ترانے لب پر جاری ہوگئے۔ مکرم شبیر احمد صاحب کو تلاش کیا اور باہمی مبارکباد کے پیغامات کا تبادلہ کیا۔

اس قسم کا رہائشی مکان پرائیویٹ سیکٹر میں چار سے پانچ صد کواچے کرایہ پر ملتا تھا جبکہ یہ مکان اللہ تعالیٰ کے فضل سے مشن کو صرف پینتالیس کواچے کرایہ پر مل گیا۔ چابی لے کر مکان کھولا تو حضرت مصلح موعود کے مبارک کلام کا یہ شعر:

غیر ممکن کو یہ ممکن میں بدل دیتی ہے
اے میرے فلسفیو زور دعا دیکھو تو

بے اختیار زبان پر آ گیا اور دل بے اختیار اللہ تعالیٰ کی حمد سے لبریز ہوگیا۔

زیمبیا کے صدر ڈاکٹر کے ڈی کاؤنڈا سے ملاقات:

زیمبیا قیام کے دوران دعوت حق کا پیغام عوام وخواص تک پہنچانے کے تمام ممکنہ طریق اختیار

کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ کبھی مملکت کے وزراء سے اس سلسلہ میں ملاقاتیں ہوئیں تو کبھی امراء سے۔ صدر مملکت تک عام حالات میں رسائی ممکن نہ تھی۔ لہٰذا انہیں خط لکھا کہ احمدیہ مشن کا وفد ملاقات کا متمنی ہے۔ اس خط کے جواب میں صدر صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری کی طرف سے اطلاع موصول ہوئی کہ یکم اپریل 1976ء کو صدر مملکت نے احمدیہ مشن کے وفد سے ملاقات کا وقت دیا ہے۔ چنانچہ وفد ترتیب دیا گیا۔ اس وفد میں خاکسار کے ساتھ جماعت زیمبیا کے اس وقت کی مجلس عاملہ کے ممبران کرام مکرم کرنل (ر) ڈاکٹر محمد رمضان صاحب، ڈاکٹر منصور شریف صاحب، ڈاکٹر محمد افضل صاحب، چودھری صادق نسیم صاحب اور مسٹر ادریس کاسا کاسا (Mr, Idryse Kasakasa) شامل تھے۔ ملاقات کے وقت خاکسار نے اسلام اور احمدیت کا مختصر تعارف اور احمدیہ مشنوں کی انسانی خدمات کے موضوع پر سپاسنامہ پیش کیا۔ یہ بھی ذکر کیا کہ ہمارے مشن اکناف عالم میں مذہب کے پرچار کے ساتھ ساتھ انسانی خدمات کے لئے ہسپتال اور سکول قائم کر رہے ہیں۔

اس موقع پر قرآن مجید (مع انگریزی ترجمہ اور مختصر تفسیر) اور اسلام پر دیگر کتب کا سیٹ صدر صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ صدر مملکت نے سپاسنامہ پر تبصرہ کرتے ہوئے احمدیہ مشن کی مذہبی اور انسانی خدمات کو سراہتے ہوئے مشن کی اس میدان میں کوششوں کی تعریف کی۔ اسی روز شام کے وقت ریڈیو اور ٹی۔وی کی خبروں میں اس ملاقات کی تفصیلی خبر شائع ہوئی اور اس سے اگلے روز بھی خبر نشر ہوتی رہی۔ اس ملاقات کا ذکر اگلے روز کے اخبارات میں جلّی عنوان کے ساتھ شائع ہوا۔ اس طرح خدا تعالیٰ کے فضل سے احمدیہ مشن کا پیغام امن نہ صرف ملک کے کونے کونے میں پہنچا بلکہ دیگر قریبی ملکوں میں جہاں جہاں زیمبیا کے ٹی۔وی پروگرام دیکھے جاتے تھے اور ریڈیو سنا جاتا تھا وہاں بھی احمدیہ مشن کی مذہبی اور انسانی خدمات کا پیغام پہنچا۔

دائیں سے: ڈاکٹر کے۔ ڈی۔ کاونڈا۔ میر غلام احمد نسیم مشنری انچارج زیمبیا۔
ڈاکٹر محمد افضل۔ ڈاکٹر کرنل محمد رمضان (بیک)

زیمبیا سے واپسی:

ہمارا خون بھی شامل ہے تزئین گلستان میں
چمن میں جب بہار آئے ہمیں بھی یاد کر لینا

زیمبیا میں خدمت اور قیام کا عرصہ قواعد تحریک جدید کے مطابق کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ دفتر تبشیر ربوہ کی طرف سے ہدایات موصول ہوئیں کہ نئے مربی مولوی عبدالباسط صاحب کو زیمبیا کے لئے تقرر ہوا ہے۔ کوائف بھجوائے جا رہے ہیں۔ ان کے لئے حکومت زیمبیا سے ویزا لے کر بھجواؤں۔ مربی صاحب موصوف تنزانیہ میں جو زیمبیا کا مشرقی ہمسایہ ملک ہے خدمات بجالا چکے تھے۔ اس لئے افریقہ کا یہ حصہ ان کے لئے کوئی نیا نہ تھا کیونکہ ان ممالک کے باسیوں کے رہن سہن میں کوئی زیادہ فرق نہ تھا سوائے اس کے کہ تنزانیہ میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی جبکہ زیمبیا میں عیسائی مذہب کے پیروکار زیادہ تھے۔ ویزا بھجوانے پر موصوف تشریف لے آئے۔ انہیں مشن کے کاموں سے متعارف کرانے کے لئے میرا چند دن ان کے ساتھ رہنا ضروری تھا۔ میں تو گذشتہ پونے چار سال سے بغیر اہل وعیال کے قیام پذیر تھا وہ بھی اکیلے ہی تشریف لائے تو ایسے محسوس ہوا کہ:

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

یہ عالم تو دیوانوں اور فرزانوں کا ہے اور ان کے دم قدم سے اس کی رونق ہے اور پھر دعوت الی اللہ کا کام تو اور بھی فرزانگی سے زیادہ دیوانگی چاہتا ہے۔ حضرت مصلح موعودؓ نے کیا خوب فرمایا'

عاقل کا یہاں پر کام نہیں وہ لاکھوں بھی بے فائدہ ہیں
مقصود میرا پورا ہو اگر مل جائیں مجھے دیوانے

(کلام محمود صفحہ 154)

مولوی صاحب موصوف بھی فرزانگی کو خیر باد کہہ کر دیوانگی کو گلے کا ہار بنائے ہوئے وارد ہوئے۔ کیونکہ انہوں نے ربوہ سے روانگی سے قبل زیمبیا اور زیمبیا میں مشن اور جماعت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔

احمدیہ مشن آف زیمبیا کو ملک میں کام کرنے کی اجازت مل چکی تھی رجسٹریشن ہو چکی تھی لیکن مشن کی حالت ابھی اس بچے کی سی تھی جو بمشکل پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہو۔ اور قدم قدم چلنا سیکھا ہو۔ اور تیزی سے چلنے کے لئے ابھی اسے وقت درکار ہو۔ مشن کو اس حد تک لانے کے لئے جن مصائب و آلام سے دو چار ہونا پڑا تھا ان کا بیان کار دارد ہے۔ سر چھپانے کی جگہ کی تلاش، احمدیوں کے شدید دشمنوں کا مقابلہ جس میں نام نہاد مسلمان پیش پیش تھے۔ دلآزار لٹریچر جو جنوبی افریقہ میں طبع ہو کر زیمبیا میں بکثرت تقسیم ہوتا تھا کا جواب اور پھر آئے دن جان سے ہاتھ دھونے کی دھمکیوں کا ملنا وغیرہ شدید مسائل درپیش تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جماعت کی افرادی قوت میں اضافہ نہ ہونے کے برابر۔ تاہم ان شدید مخالف حالات کا مقابلہ اور سامنا کرتے ہوئے افتاں وخیزاں دعوت الی اللہ کا کام جاری رہا۔ باد مخالف کی تندی و تیزی کے باوجود اس خیال اور یقین سے کہ یہ ہمیں اور اونچا اڑانے کے لئے چل رہی ہے۔ جیسا بھی ہوا برابر کام کرتے چلے گئے اور صبح و مساء کی مصروفیت میں خون و پسینہ ایک ہوتا رہا۔ ایسے میں کبھی کبھار کسی ہم جیسے حالات سے دو چار ہونے والے شاعر کا یہ شعر زبان پر بے اختیار آ جاتا:

ہمارا خون بھی شامل ہے تزئین گلستان میں
چمن میں جب بہار آئے ہمیں بھی یاد کر لینا

مربی صاحب کو مشن کے جاری منصوبوں سے متعارف کرانے، زیر تبلیغ احباب سے ملانے اور حکومت کے کارندوں سے جن سے آئے دن واسطہ پڑتا رہتا ہے ملاقات و تعارف کرانے میں چند دن ان

کے ساتھ گھومتے ہوئے مندرجہ بالا شعر نوک زبان پر آ جاتا۔ موصوف شعر دہراتے اور فرماتے چمن میں بہار آنے پر کون کسی کو یاد کرتا ہے یا مستقبل میں یاد کرے گا۔ تاہم دل بہلانے کے لئے یہ خیال اچھا ہے۔

زیمبیا میں پونے چار سال کے قیام کے دوران جن احباب سے تعلقات قائم ہوئے تھے۔ انہیں اوداع کرنے کا خیال آتے ہی دل غمگین ہو جاتا اور زبان پر بے اختیار یہ مصرع آتا:

ع وداع و وصل جدا لذتے دارد

لیکن دوسرا مصرع زبان پر لانے کی ہمت نہ پڑتی۔ ایک جانت تو ان کے قرب سے دور ہونے کا کرب محسوس ہوتا اور دوسری جانب اپنے اہل وعیال، خویش و اقارب اور دیرینہ احباب اور سب سے بڑھ کر خلیفہ وقت سے ملاقات کے تصور کی خوشکن تصویر ابھرتی۔ ان دونوں حالتوں کی کشمکش کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو ایسے حالات سے دوچار ہو چکا ہو۔ اپنی جماعت کے دوستوں اور جماعت کے ہمدردوں اور بہی خواہوں کی نیک وقت الوداعی اور خوش آمدید کی چند دعوتوں کے بعد مشن کی طرف سے بھی ایک دعوت شیراز کا انتظام کیا گیا۔ اس دعوت میں جدائی کے غم اور ملاقاتوں کی امید کی خوشی کے ملے جلے جذبات نثری نظم کا جامعہ پہنانے کی کوشش کی جو جذبات کے غلبہ کی نظر ہو کر دم توڑ گئی اور حالت یہ تھی کہ:

اک حرف بھی نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھوں
میں آنسو آ بھی گئے

دراصل حقیقی خدمت وہی ہے جو خدمت کی خاطر کی جائے نہ کہ کسی خواہش اور نام ونمود کے لئے۔ اسی جذبہ کے تحت حالات کی سنگینی اور دشمنوں کی مخالفت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے آگے ہی آگے قدم بڑھاتے رہے۔ جنہوں نے ان مشکل حالات میں ساتھ دیا تھا ان سے جدائی گراں معلوم ہو رہی تھی۔ تاہم بالآخر وہ دن آ گیا کہ رخت سفر باندھنا ہی پڑا۔ احباب سے الوداعی ملاقات کرتے ہوئے بے اختیار ان کے لئے دعائیں بھی زبان پر جاری ہوتیں اور ساتھ ہی یہ بھی:

ع الوداع اے قافلے والو اب مجھے چھوڑ دو

ان ہی خیالات و جذبات کے ساتھ 'لوساکا' ہوائی مستقر کو روانہ ہوئے۔ بعد ازاں جہاز میں دوران سفر جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔ ''صبح سوا نو بجے ہوائی سفر شروع ہوا۔ قیو۔ زیڈ (QZ) ایر لائن ہواؤں کے دوش پر رواں دواں ہے اس میں ہم بھی خیالات میں غلطاں و پیچاں سوئے منزل رواں

دواں ہیں۔ مسافر باتوں میں مصروف ہیں۔ زیمبیا کو تین سال نو ماہ اور نو روز کے طویل عرصے کے بعد خیر باد کہہ رہا ہوں لوساکا (Lusaka) کے احمدی احباب نے پرخلوص دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت ہونے سے قبل ایک تقریب کی جو خاص دلچسپ تھی۔ آج 24 جولائی 1979ء کی صبح ڈاکٹر محمد افضل احمد اپنی کار پر ہوائی مستقر چھوڑنے آئے۔ ہمارے ہمراہ مولوی عبدالباسط صاحب، مکرم ادریس کاساکاسا (افریقن ممبر) اور مبارک احمد صاحب بھی تشریف لائے۔ بعد ازاں مکرم خالد احمد صاحب مع اہلیہ، یوسف حلمی صاحب اور ڈاکٹر منصور شریف صاحب بھی تشریف لے آئے۔ آخر میں خدا کے حضور پُرخلوص دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ الوداع کہا۔ آخر میں خدا کے حضور ہاتھ اٹھا کر خاموش دعا ہوئی اور ہر ایک سے باری باری گلے مل کر بوجھل قدموں کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بوجھل پلکوں اور بھرائی ہوئی آواز سے سب کو خدا حافظ کہا۔

ہوائی جہاز میں جذبات اور حالات کے تانیں بانیں ملاتے ہوئے نیروبی، کینیا کے ہوائی مستقر پر کچھ قیام کے بعد اگلے جہاز پر کراچی کے لئے روانہ ہوئے۔ دو روز بعد جب ربوہ گھر پہنچا تو لگا جیسے سب کچھ بدل چکا ہے۔ گھر سے چار سال قبل روانگی کے وقت جو بچہ پانچ سال کا تھا وہ اب 9 سال کا ہو چکا تھا اور جو 9 سال کا تھا وہ 13 سال کا ہو گیا ہے اور مسے پھوٹ رہے ہیں۔ پہنچانا ہی مشکل ہے۔ یاالٰہی یہ کیا۔ یہ بچے ویسے ہی معصوم کیوں نہیں جیسے چار سال قبل تھے میرے ذہن میں تو شبیہیں گھوم رہی تھیں۔ لیکن وقت کو کون روک سکتا ہے۔ وقت تو رواں دواں ہے اور خود تو بدلتا نہیں لیکن دنیا کی ہر چیز کو تبدیل کرتا چلا جاتا ہے۔ بچے جوان ہو رہے ہیں، جوان بوڑھے ہو رہے ہیں اور بوڑھے! ہاں بوڑھوں کو وقت نگل رہا ہے اور کہ اللہ بس اور باقی ہوس!

باب ششم

رو میں ہے رخشِ عمر

رو میں ہے رخشِ عمر دیکھئے کہاں تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں
(غالب)

جنم بھومی موضع دھوڑیاں بھاٹہ علاقہ پونچھ کشمیر ہے۔ بچپن قدرتی چشموں کے جرنوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے گذرا۔ دیہاتی ماحول کی اپنی ہی جلوہ گری ہوتی ہے اور پھر کشمیر جنت نظیر کے دیہات اور ہر طرف جلوہ فروز قدرتی مناظر دعوت نظارہ دیتے ہیں۔ ایک طرف فلک بوس کوہ استادہ ہیں تو دوسری طرف دامنِ کوہ میں تا حد نظر پھیلی ہوئی وادیاں اور ان کے بیچوں بیچ بہتی ہوئی ندیاں عجیب ساماں پیدا کرتی ہیں۔ برف پوش پہاڑوں کی چوٹیاں اور گل پوش وادیاں بیک وقت دعوت نظارہ دیتی ہیں۔ وادیاں موسم بہار کی آمد کے ساتھ ہی گل پوش ہو جاتی ہیں جبکہ کوہساروں کی فلک بوس چوٹیاں برف کی چادر اوڑھے ہوئے موسم کی تبدیلی ان حسین قدرتی نظاروں پر کچھ اس طریق سے اثر انداز ہوتی ہے کہ طبیعت میں بالکل نا قابلِ بیاں شگفتگی پیدا ہوتی ہے اور انسان خود بخود گنگنانے لگتا ہے۔ گڈریے لوک گیتوں اور بنسریوں کی تان سے فضا کو جو گلوں نے معطر کی ہوتی ہے مرتعش کرتے ہیں۔

بچپنا خود ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ فکر معاش، فکر فردا بلکہ کسی قسم کے فکر سے آزاد ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہمارا بچپن بھی قدرتی نظاروں میں گھرے ہوئے اس حصہ کائنات میں بسر ہوا۔ موسموں کی تبدیلیوں کے ساتھ انسانوں کے رویوں اور طبائع کی جولانی متاثر کرتی ہے۔ یادوں کے جھروکوں میں جھانکنے سے بہت ہی کم عمری کا ایک واقعہ ذہن میں ابھرتا ہے اور وہ یہ کہ ہماری رشتہ میں ایک چچی بیمار تھی اور

بیماری نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ انہیں خود احساس ہو گیا کہ اب ان کی گنتی کی سانسیں باقی ہیں۔ زندگی کی ڈور کسی وقت بھی ٹوٹ سکتی ہے۔ ایسے میں تیمار داری کرنے کے لئے چند رشتہ دار جمع تھے اور بیمار کے بہلاوے کی باتیں ہو رہی تھیں کسی نے کہا موسم بہار دہلیز پر پہنچ چکا ہے اور آیا کہ آیا۔ اور موسم بہار کے ذکر کے ساتھ یہ بات لازمی ہے کہ پھولوں کا بھی ذکر ہو جب یہ ذکر ہو رہا تھا تو بسترِ مرگ پر پڑھی ہوئی بیمار نے نڈھال سی آواز میں پُرسوز انداز میں اور آواز میں گنگنانا شروع کیا۔

آئی بہار بنفشا پھلسیا
کوئی قسمت والا چنسیا

کہ بہار آنے پر بنفشے کے پھول کھلیں گے لیکن انہیں کوئی قسمت والا ہی چنے گا۔ گو کہ یہ عام سا دوہا تھا لیکن بیمار اور نحیف آواز اور موقع کی مناسبت سے اس کی ادائیگی نہایت متاثر کن تھی۔ سب نے داد دی اور بیمار کو تسلی کے لئے کہا کہ کوئی ایسی بات نہیں۔ آپ کی قسمت یاوری کرے گی اور آنے والی بہار کے پھول آپ چنیں گی۔ دراصل اس قدرتی اور طبعی ماحول میں جب موسم بہار میں ہمارے علاقہ میں کثرت سے پھول کھلتے تھے تو ان میں بنفشہ کے پھول کثرت سے ہوتے تھے جنہیں وہاں کے باسی چن کر محفوظ کر لیتے تھے اور یہ پھول بعض بیماریوں میں استعمال ہوتے تھے۔ ایک تو بیمار کا اس طرف اشارہ تھا اور پھر دنیا کی بے ثباتی کا ذکر گویا 'ایک تغیر کو ہے ثبات زمانے میں' پھر یوں ہوا کہ واقعی اس موسم بہار کی آمد کے ساتھ ہی ان کی حیات کی تان ٹوٹ گئی اور اسی موسم بہار کے پھول چنے بغیر ہی وہ عدم آباد کے سفر پر روانہ ہو گئیں۔ اللہ بس اور باقی ہوس!

ہجرت:

مدتوں گاتے رہے جس صبح آزادی کے گیت
جب قریب آئی تو غم کی شام ہو کر رہ گئی

شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی برصغیر کو آزادی ملی اور ا[illegible] تقسیم بھی عمل میں آئی اور ساتھ ہی کشمیر کا تنازع کھڑا ہو گیا۔ ہمارا علاقہ اس تنازع کی بنا پر جنگ کی لپیٹ میں آ گیا اور ہمیں اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑی۔ افتاں وخیزاں پاکستان پہنچے اور موضع چک جمال، ضلع جہلم میں کچھ ماہ قیام رہا

وہیں والد ماجد نے بڑی ہی کسمپرسی کی حالت میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ کچھ اور رشتہ دار بھی وہاں فوت ہوئے۔ چک جمال میں فوجی بیرکوں میں جو اس وقت خالی تھیں مہاجرین کے لئے حکومت پاکستان نے عارضی طور پر رہائش کے انتظامات کئے ہوئے تھے لیکن مہاجرین کی کثرت کی وجہ سے خورد و نوش اور علاج معالجے کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ میں نے چونکہ پہلے ہی حصول تعلیم کی غرض سے جامعہ احمدیہ میں داخلہ لے رکھا تھا۔ لہٰذا میں جامعہ کے جو اس وقت احمد نگر تحصیل چنیوٹ، ضلع جھنگ میں قائم تھا، چلا گیا۔ کچھ سال احمد نگر میں قیام رہا۔ ربوہ آباد ہونے پر وہاں منتقل ہو گیا۔ ربوہ ہی کو مستقل رہائش کے لئے انتخاب کیا۔ حیاتِ مستعار کے ساتھی کا انتخاب بھی وہیں ہوا۔

مغربی افریقہ:

تکمیل تعلیم کے بعد خدمت دین کے لئے سیرالیون، مغربی افریقہ جانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہاں قیام اور کام کی تفصیل کا ذکر پہلے کسی باب میں ہو چکا ہے۔ سیرالیون سے واپسی کے دوران شیکسپیئر کے وطن یعنی انگلینڈ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ طالبعلمی کے زمانے میں شیکسپیئر کے بعض ڈرامیں جو نصاب کا حصہ تھے پڑھتے ہوئے یہ خواہش ہوتی کہ کاش اس کے ملک کو بھی دیکھ سکیں۔ چنانچہ یہ خواہش پوری ہوئی اور حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ لنڈن میں قیام غیر متوقع طور پر پانچ چھ ہفتوں پر پھیل گیا اور خوب جی بھر کر جائزہ لیا اور بہت قریب سے اس ملک کی معاشرت اور معاش دیکھی۔ جو لطف پہلی مرتبہ وہاں جانے اور قیام کرنے پر آیا وہ دوبارہ میسر نہ آ سکا۔ سیرالیون خدمت دین کا کام قریبًا تین سال رہا اور واپسی دسمبر 1963ء کو ہوئی۔

جنوبی امریکہ:

مئی 1965ء کو گی آنا، جنوبی امریکہ کے لئے روانہ ہوا۔ چند دن لنڈن انگلینڈ میں قیام کے بعد گی آنا پہنچا۔ گی آنا میں دعوت الی اللہ کی غرض سے قیام کے دوران سورینام جو اس وقت ڈچ گی آنا تھا بھی وقتًا فوقتًا دعوت الی اللہ کی غرض سے جاتا رہا۔ وہاں پر احمدیہ مشن جو بوجوہ بند ہو چکا تھا اسے دوبارہ شروع کرنے کی غیر معمولی توفیق ملی۔ سورینام میں مشن قائم ہونے کے کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا تھا اور جماعت کے

افراد بکھرے چکے تھے۔ وہاں دوروں کی وجہ سے وہ دوبارہ جماعت کی صورت میں متحد ہوئے اور شیرازہ بندی کے بعد نئی فعال تنظیم نے جنم لیا۔ سورینام سے فرنچ گی آنا کا بھی دورہ کیا لیکن وہاں جماعت کے قیام کی کوئی خاطر خواہ صورت نظر نہ آئی۔ محدود ذرائع کی وجہ سے زیادہ قیام ممکن نہ ہو سکا۔ تاہم سورینام اور گی آنا ہر دو ممالک میں کام کرنے کی بھرپور توفیق ملی اور مقدور بھر کام کیا۔ احمدیہ مشنوں کو مضبوط بنیادیں نصیب ہوئیں۔ اور ان ہر دو ممالک میں ہر طبقہ تک رسائی رہی۔ گی آنا کے سربراہ مملکت کو ذاتی طور پر مل کر اسلام کا پیغام پہنچایا۔ گی آنا سے جولائی 1970ء کو واپسی پر جزائر غرب الہند کے جزیرے ٹرینیڈاڈ میں مختصر قیام کیا۔ وہاں کی جماعت میں کچھ اختلافات تھے انہیں رفع کرنے کی مقدور بھر کوشش کی۔ اس وقت وہاں کے مرکزی مربی مکرم حنیف یعقوب صاحب تھے۔ مکرم محمد اسحاق ساقی صاحب جو ان سے پہلے مرکزی مربی رہ چکے تھے۔ ان سے اور ان کے ملنے والوں اور ہمدردوں سے ملاقاتیں کیں اور اختلافات کو نظر انداز کر کے باہم مل کر جماعت کی مضبوطی اور ترقی کے لئے کام کرنے کی تلقین کی۔

امریکہ:

ٹرینیڈاڈ سے روانہ ہو کر جزیرہ برمیودہ (Bermuda) رات بسر ہوئی۔ برمیودہ ایک نہایت خوبصورت جزیرہ ہے اور امریکہ کے سیاحت کے رسیہ لوگوں کا یہاں ہر وقت تانتا بندھا رہتا ہے۔ یہاں کے ہوٹلوں کے کمرے مہینوں پہلے سے ریزرو ہوتے ہیں۔ جس کا مجھے علم نہ تھا۔ ہوائی مستقر سے باہر آیا تو وہاں پر موجود ایجنٹوں سے رابطہ کرنے پر معلوم ہوا کہ کسی قریب کے ہوٹل میں جگہ نہیں ایک دور کے ہوٹل میں کمرہ ہے وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ تمام کمرے پُر ہو چکے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور اچھا آدمی تھا اس نے بتایا کہ اس کے پڑوس میں ایک عمر رسیدہ جوڑا رہتا ہے انکے ہاں ایک کمرہ ہے جو کرایہ پر دیا کرتے ہیں ان سے معلوم کر لیتے ہیں۔ میں نے اس سے اتفاق کیا تو وہ وہاں لے گیا۔ حسن اتفاق سے اس روز ان کا کمرہ خالی تھا کرایہ کی بات بھی طے ہو گئی اور اس طرح رات وہاں بسر ہوئی۔ اگلے روز وہاں سے نیو یارک روانہ ہوئے۔ نیو یارک کے کینیڈی ہوائی مستقر پر مکرم عبدالہادی ناصر صاحب مع چند دیگر احباب کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ نیو یارک میں ہفتہ عشرہ کا قیام تھا ان دوستوں نے مقدور بھر نیو یارک کی سیر کرائی۔ جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لئے سینٹر گئے اور احمدی احباب سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہاں سے لنڈن پہنچا۔ لنڈن کے

احمدیہ مشن میں ان دنوں [illegible] صاحب مربی انچارج تھے۔ انہوں نے ازراہِ شفقت ایک احمدی [illegible] کا انتظام کر رکھا تھا۔ لنڈن چند دن قیام کے بعد فرنکفورٹ، جرمنی روانہ ہوا۔ [illegible] چھوٹے بھائی عبدالکریم صاحب طارق قیام پذیر تھے ان سے ملاقات کے علاوہ [illegible] فرنکفورٹ کی زیارت بھی مقصود تھی۔ احمدی احباب سے ملاقات ہوئی۔ وہاں دو روز کے قیام کے بعد [illegible] روانہ ہوا۔ کراچی سے اگلے روز بذریعہ چناب ایکسپریس روانہ ہو کر سہ پہر ربوہ پہنچا۔ الحمد للہ

گی آنا سے 16 جولائی 1970ء کو روانہ ہوا تھا۔ مختلف مقامات اور ممالک سے ہوتے ہوئے 8 اگست کو مرکز میں پہنچا۔ ان مقامات اور ممالک میں جانا محض سیر وسیاحت نہیں تھی بلکہ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے خدمت دین اور اشاعت کا کام بھی مدنظر تھا۔ بائیس تئیس دن کا یہ سفر یادگار سفر تھا۔ اس میں بہت سے ممالک دیکھنے کا موقعہ میسر آیا اور ان میں قائم احمدیہ مسلم مشنوں کے طریق کار کے مطالعہ کا بھی موقعہ ملا۔ ہر ملک کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ ان میں دعوت الی اللہ کا طریق بھی حالات کے مدنظر ہی ترتیب دیا جاتا ہے۔

زیمبیا، وسطی افریقہ:

اگست 1970ء سے اکتوبر 1975ء تک ربوہ میں قیام رہا۔ اس دوران جامعہ احمدیہ میں تدریس کا کام سپرد رہا۔ خصوصاً غیر پاکستانی طلبہ جو دینی تعلیم کی غرض سے آتے انہیں پڑھانے کا کام سپرد رہا۔
15 اکتوبر 1975ء کو زیمبیا پہنچا۔ 25 جولائی 1979ء قریباً پونے چار سال زیمبیا میں دعوت الی اللہ کا کام حسب توفیق جاری رہا۔ اس دوران وہاں کی مقتدر ہستیوں تک پیغام پہنچانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ صدر مملکت کو قرآن عظیم کا تحفہ گران وہاں کی جماعت کے عہدیدران کے ہمراہ پیش کرنے کا موقع ملا۔ فالحمد للہ

جامعہ احمدیہ میں بطور استاد تقرری:

زیمبیا سے واپسی پر جنوری 1980ء کو جامعہ احمدیہ میں تدریس کا کام سپرد ہوا۔ کچھ عرصہ بیرون پاکستان سے آئے ہوئے طلبہ کی تعلیم و تربیت کی۔ بعدازاں تاریخ اور تصوف کے مضامین کی تدریس سپرد ہوئی۔ ان ہر دو مضامین کی تدریس کے ساتھ ساتھ نظامت امتحانات کے فرائض کی ذمہ داری بھی نبھانے کی توفیق ملی۔ اس دوران سلسلہ کی طرف سے وقتاً فوقتاً تفویض کردہ بعض دیگر فرائض بھی انجام دینے کی

سعادت ملتی رہی۔ چند برس مرکزی قاضی کی اضافی ذمہ داری نبھانے کی توفیق پائی۔

اس عرصہ میں ہمارے اپنے بچوں کی تعلیم بھی تکمیل کو پہنچی۔ ہمارے چاروں بچوں نے طب کی تعلیم حاصل کی اور نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس احسان پر جتنا بھی اس قادر ہستی کا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

1۔ عزیزہ امۃ الشکور نے 1984ء میں ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا۔
2۔ عزیز میر شریف احمد نے 1987ء میں ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا۔
3۔ عزیزہ مہہ جبین نے 1989ء میں ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا۔
4۔ عزیز میر مقبول احمد نے 1994ء میں ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا۔

یہ چاروں بچے برسر روزگار ہیں۔ سب کی شادیاں ہو چکی ہیں اور خدا تعالیٰ کے فضل سے سب صاحب اولاد ہیں۔

ایک سہانا خواب:

پانچ اور چھ دسمبر 1985ء کی درمیانی شب کو آنحضرت ﷺ کی شبیہ مبارک خواب میں دیکھی اور چھ تاریخ کی صبح کو اسے قلمبند کر لیا۔

> ''صحراء کا سماں ہے اور وسیع میدان ہے۔ نماز کی ادائیگی کے لئے صفیں آراستہ ہو رہی ہیں۔ میں اگلی صف کی بائیں جانب قریباً آخر میں کھڑا ہوں۔ جس طرف صفوں کا رخ اور امام کے کھڑا ہونے کی جگہ ہے وہ نشیب میں ہے اور ہر صف میں کھڑا انسان امام کو بخوبی دیکھ سکتا ہے۔ صف بندی پر رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے ہیں۔ قد میانہ لیکن کوتاہ نہیں بلکہ نکلا ہوا ہے ریش مبارک کے میں کچھ بال سفید ہیں۔ نہایت وجیہہ دکھائی دیتے ہیں۔ صفوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد نماز پڑھاتے ہیں۔ سب احباب سجدہ ریز ہوتے ہیں میں بھی ان میں شامل ہوں۔ سجدہ گاہ کی جگہ ریتلی سی معلوم ہوتی ہے جیسے صحراء کی زمین ہوتی ہے۔ حضور ﷺ اختتام نماز پر حاضرین کی طرف رخ مبارک کر کے رونق افروز ہوتے ہیں۔ ایک آدمی آگے بڑھتا ہے وہ کوئی بات پوچھنا چاہتا

ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نا پسندیدگی کا اظہار فرماتے ہیں اور وہ واپس چلا جاتا ہے۔''

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''من رانی فقد رای الحق فان الشیطان لا یتمثل بی ''یعنی جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے حق دیکھا کیونکہ شیطان میری تشبیہ نہیں اختیار کرسکتا۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

2- امریکہ آمد اور جراحی قلب:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خون نکلا
(آتش)

مرض قلب کی تشخیص ہوئے تین چار سال کا عرصہ گذر چکا تھا۔ بریگیڈیئر ڈاکٹر مسعود الحسن نوری صاحب جو مشہور ماہر امراض قلب ہیں نے معائنہ کرکے بتایا کہ انجائنا ہے۔ انہوں نے کچھ دوائیاں تجویز کیں۔ یہ دوائیاں استعمال میں رہیں۔ اسی دوران ہمارے بیٹے ڈاکٹر میر شریف احمد نے ہمارے لئے امریکہ سے امیگرانٹ ویزا کے حصول کے لئے درخواست دی۔ ویزا ملنے پر 5 مارچ 1997ء کو امریکہ پہنچے۔ جون کے تیسرے ہفتہ جماعت احمدیہ امریکہ کا سالانہ جلسہ دیکھا جو واشنگٹن میں منعقد ہوا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ سے قریباً 13 سال بعد ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ایک ہفتہ بعد جماعت احمدیہ کینیڈا کا جلسہ منعقد ہونے والا تھا اس میں شمولیت کا پروگرام بنا کر واپس نیوجرسی جائے قیام پہنچے تو طبیعت زیادہ ہی ناساز ہوگئی۔ چنانچہ کینیڈا جلسہ پر جانے کا پروگرام ملتوی کرنا پڑا۔ ہسپتال میں معائنہ کروانے پر معلوم ہوا کہ دل کی دو شریانیں بند ہیں اور تیسری بھی بند ہوا چاہتی ہے۔ اسی وقت ہسپتال میں داخل ہوگیا۔ سرجن سے مشورے پر اگلے روز ہی دل کا بائی پاس اپریشن تجویز ہوا۔ پردیس اور پھر بے سروسامانی کی حالت نے نڈھال کردیا۔ رہ رہ کر خیال آتا کہ اپریشن کا گراں قدر خرچ کہاں سے آئے گا اور کون برداشت کرے گا۔ یہ ذکر کرتا چلوں کہ امریکہ میں علاج بہت مہنگا ہے۔ اس قسم کے اپریشن پر لگ بھگ ستر ہزار ڈالرز خرچ آتا

ہے۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ میڈیکیڈ (Medicaid) (بے وسیلہ افراد کے لئے حکومت کی طرف سے علاج کا خرچ) کے حصول کے لئے درخواست دے رکھی ہے شائد وہ منظور ہو جائے۔ ان ہی خیالات میں ہر لرداں رات ہسپتال میں ہی بسر ہوئی۔ حسب پروگرام اگلے روز اپریشن ہوا۔ چند دن ہسپتال کے قیام کے بعد گھر آ گیا۔ گھر آنے پر ہسپتال سے ایک آدھ میڈیکل بل موصول ہوئے جس سے پریشانی میں اضافہ ہونا لازمی امر تھا۔ بہرکیف چند دن گذرے کہ میڈیکیڈ جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، کی منظوری کی اطلاع موصول ہوئی۔ اس فانی دنیا کی حیاتِ مستعار میں غالباً ہر انسان کے لئے کوئی نہ کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ رونما ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں جسے وہ اپنی ذات کے لئے معجزہ قرار دینے میں حق بجانب نہ ہو۔ میرے لئے بھی یہ سب کچھ معجزہ سے کم نہ تھا۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ میں پاکستان سے امریکہ روانگی کے لئے کم از کم اس وقت تیار نہ تھا لیکن حالات ایسے رونما ہوئے کہ جن کی وجہ سے امریکہ روانہ ہونا ناگزیر ہوگیا۔ لیکن اس نیت کے ساتھ کہ تین چار ماہ کے بعد واپسی ہوگی۔ پھر امریکہ میں دل کی تکلیف زیادہ ہوگئی۔ بائی پاس اپریشن کی تجویز نے اپریشن کے غیر معمولی اخراجات کی ادائیگی کا سوال پیدا کیا تو خدائے ذوالجلال، رحمان و رحیم نے معجزانہ طور پر ان کی ادائیگی کا سامان پیدا کردیا جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ سب کام غیبی تائید سے ظہور پذیر ہوئے اور ہوتے چلے گئے۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اچانک یوں کامیاب دل کا اپریشن ہوگا اور اس اپریشن کے تمام اخراجات کی ادائیگی کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔ یہ سب کچھ اس انداز میں ظہور پذیر ہوا کہ کم از کم میری ذات کے لئے تو معجزہ ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس کی وجہ سے بقیہ حیات میں دل، خدا تعالیٰ کی حمد کے ترانے سے لبریز ہے اور جب تک دھڑکتا رہے گا لبریز ہی رہے گا۔ انشاء اللہ۔

لکھا ہے جو مقدر میں وہی ہو گا وہی ہو گا
وہیں لے جائے گی قسمت جہاں آب و دانہ ہوگا

کم وبیش اڑھائی سال ہونے کو آئے کہ North Brunswik نیوجرسی میں قیام ہے۔ مئی 01ء کی ایک دوپہر کو ہواخوری کے لئے نکلا ہوں قریب ہی ایک پارک ہے۔ سیرگاہ بھی ہے۔ دوپہر کا وقت ہونے کے باوجود موسم خوشگوار ہے۔ گہرے نیلگوں آسمان پر سورج چمک رہا ہے لیکن تمازت زیادہ نہیں۔ میں کھلے آسمان تلے سیرگاہ میں بیٹھا زندگی کے نشیب فراز پر سوچ میں گم ہوں۔ کہاں جنم ہوا، کہاں لا ابالی کے ایام گذارے، کہاں کہاں کا دانہ پانی نصیب ہوا۔

زندگی مستعار کی یہ سترویں (70) بہار یا خزاں دیکھ رہا ہوں۔ حیاتِ مستعار کا یہ دور کہیں اور یعنی ''ربوہ'' پاکستان میں بسر کرنے کی تمنا تھی لین ''بسا آرزو کہ خاک شد'' حالات وواقعات کہاں لے آئے ہیں۔ امریکہ۔ ہاں ایام شباب میں امریکہ دیکھنے کی حسرت ضرور تھی۔ لیکن ایام پیری میں تو نہ تھی۔ ایام پیری میں شاید اس حسرت یا تمنا کی یہ سزا یا جزا ہے کہ گذشتہ پونے تین سال سے نیو جرسی، امریکہ میں قیام ہے ارو نہ جانے مزید کب تک رہے گا۔ یہ شب گریزاں ہوگی بھی یا نہیں۔

میر غلام احمد نسیم مربی سلسلہ
مئی 2001ء

3- دنیا کے کناروں تک:

جب ہم نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ ہمارے تائے چچے اور ان کے چچا زاد ماموں زاد بہن بھائی وغیرہ قریب قریب ہی رہائش پذیر ہیں۔ زیادہ ہی اگر کوئی دور ہے تو وہ بھی ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر قیام پذیر ہے۔ دور کے رشتہ دار بھی قرب وجوار میں ہی رہتے ہیں لہذا ان سے میل ملاقات رہتی ہے۔ اور قریبًا یہی حال دسرے خاندانوں کے افراد کا ہے۔ ہم نے جب ہوش سنبھالا تو بڑے وثوق سے اندازہ لگایا کہ ہمیشہ سے ہی ایسا ہوتا آیا ہوگا اور ایسے ہی ہوتا رہے گا۔ لیکن ہمارے ہوش سنبھالنے کے کچھ دیر بعد اختلافات زمانہ نے ہمیں ایسا آلیا کہ ہوش ہی اڑ گئے۔

دوسری عالمی جنگ ختم ہوتے ہی یورپ کے جن ممالک نے دنیا بھر کے جن جن خطوں پر زبردستی قبضے جمائے ہوئے تھے ان خطوں اور علاقوں نے انگڑائی لینی شروع کی اور آزادی حاصل کرنے کے جذبوں نے زور پکڑا۔ برصغیر ان میں سے پیش رو تھا۔ چنانچہ برطانیہ نے برصغیر کو بامر مجبوری آزادی دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اگست 1947ء میں اسے آزادی دینے کے فیصلہ کے ساتھ ہی اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ برصغیر کشور ہند یا ہندوستان تھا۔ تقسیم سے ایک اور نیا ملک پاکستان کے نام سے دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا۔ پاکستان ہندوستان کے ان علاقوں کو ملا کر بنانے کا فیصلہ ہوا جہاں مسلمانوں کی آبادی کی اکثریت تی۔ اس کا عوام نے یہ مطلب لیا کہ ان علاقوں کی اقلیتیں وہاں سے ہجرت کر جائیں گی۔ لیکن اس وقت کے حکمرانوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے اقلیت والے علاقوں سے تبادلہ کا کوئی معین اور قابل عملی منصوبہ تیار نہ کیا۔

حکومت برطانیہ غالبًا اس خوش فہمی میں تھی کہ اقلیتیں اپنے اپنے علاقوں میں محفوظ ہوں گی اور نئی قائم شدہ حکومتوں کو ہی انتظامی لحاظ سے مختار سمجھیں گی۔ عوام کا بھی کم وبیش یہی خیال ہوگا۔ لیکن تقسیم کے منصوبے اور پھر اعلان ہوتے ہی اکثریت والے علاقوں میں اکثریت اقلیتوں پر حملہ آور ہوگئی۔ ان کی جائیدادیں لوٹ لیں اور ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگوں کو جان سے مار ڈالا۔ قتل وخون کا بازار گرم ہوگیا۔ افراتفری کا یہ عالم بن گیا کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ اسی طرح تبادلہ آبادی ایک مہیب منظر بن کر رہ گیا۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہوگئے اور لاکھوں لقمہ اجل بن گئے۔

ملک کو تقسیم کرنے کے فیصلہ کی تفصیلات طے کرتے ہوئے ایک ایسا فیصلہ بھی کیا گیا جس کی سزا معصوم لوگ اور ان کی نسلیں نصف صدی سے زائد عرصہ ہوا کہ اب تک بھگت رہی ہیں اور نہ جانے کب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ فیصلہ یہ تھا کہ ہندوستان کے وہ علاقے جو براہ راست برطانیہ کے تاج کی عمل داری میں نہ تھے بلکہ باجگذار تھے اور انہیں اندرونی طور پر کسی حد تک خودمختاری حاصل تھی انہیں اختیار ہوگا کہ وہ دونوں نئی قائم مملکتوں میں سے جس ملک کے ساتھ چاہیں الحاق کر لیں۔ تاہم آبادی کا خیال رکھنا ہوگا کہ وہاں کے عوام کس مذہبی اکثریت سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ کس ملک سے الحاق چاہتے ہیں۔ نیز یہ بھی اختیار دیا گیا کہ اگر کوئی اس قسم کی ریاست (سٹیٹ) خودمختار رہنا چاہتی ہو تو وہ ایسا کر سکتی ہے۔ اس ناقابلِ عمل فیصلے نے جہاں بہت سے جھگڑے کھڑے کر دئے وہاں سب سے زیادہ نمایاں اور بھیانک جو تنازع پیدا ہوا وہ ''تنازع کشمیر'' ہے جو نصف صدی سے زائد عرصہ گذرنے کے باوجود کسی کروٹ نہیں بیٹھا یا نہیں بیٹھنے دیا گیا اور نہ ہی حل ہونے دیا جاتا ہے۔ کشمیر کے باسیوں کی قسمت میں شائد یہی لکھا تھا اور کہ جہاں برصغیر کے طول وعرض میں آزادی کے شادیانے بجنے لگے۔ آزادی کی نعمتوں سے لوگ استفادہ کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے وہاں ہمیں کہنا پڑا:

؎ قسمت کی خوبی دیکھئے کہاں ٹوٹی کمند
دو چار ہاتھ جب لب بام رہ گیا

ہماری آزادی کی خوشیاں منانے کی آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ آرزوئیں آہ وبکا کی صورت میں بدل کے رہ گئیں۔ آزادی کا سورج 14 اگست 1947ء کو طلوع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی تبادلہ آبادی اور قتل وغارت کا آغاز ہوگیا۔ ریاست جموں وکشمیر میں اس کی بھرپور تمازت اکتوبر میں

پوری شدت کے ساتھ شروع ہوئی۔ اسی ماہ ہمارے علاقہ کے لوگوں نے اپنے طور پر آزادی کا جھنڈا بلند کر کے ڈوگرا حکومت کے کارندوں کو اپنے اپنے علاقے سے نکال باہر کیا۔ نتیجۃً بہت سا علاقہ آزاد ہو گیا لیکن شہروں اور بڑے قصبوں پر ڈوگرا راج بدستور قائم رہا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد ان کی مدد کے لئے بھارتی افواج بذریعہ طیاروں کے ان شہروں اور قصبات میں اتار دی گئیں۔ اس طرح جو علاقے آزاد ہوئے وہ انتظامی لحاظ سے کسی کے ماتحت نہ رہے اور بدانتظامی کا شکار ہو کر رہ گئے اور یہ حالت قریبًا سال بھر رہی۔ اس عرصہ میں بھارت اپنی مسلح افواج میدان میں لے آیا اور بھرپور حملہ کر کے سارے علاقے کو تہ تیغ کر دیا۔ آبادیوں کو نذر آتش کر دیا۔ لوگ اپنے علاقے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور پا پیادہ چل کر جنگلوں اور غاروں میں پناہ لیتے ہوئے رواں دواں ہوئے۔ یہ لوگ دن کے وقت حملوں سے بچنے کے لئے جنگلوں میں چھپ کر وقت گذارتے اور رات کو چل پڑتے۔ اس طرح جو قتل و غارت سے بچ گئے وہ پاکستان کی سرحد عبور کر کے پاکستان کی نوزائیدہ مملکت میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔

اسی افراتفری میں ڈیڑھ سال گذر گیا تا آنکہ جنوری 1949ء میں یہ خبر ملی کہ دونوں ملکوں کے درمیان اقوام متحدہ نے فائر بندی کا معاہدہ کروا دیا ہے اور اب ریاست جموں وکشمیر میں رائے شماری ہو گی اور وہاں کے باشندوں کی رائے کے مطابق کہ وہ دونوں میں سے کس ملک میں شامل ہونا چاہتے ہیں فیصلہ ہوگا۔ اس خبر سے عوام کو کسی حد تک چین نصیب ہوا۔ تاہم جو لوگ بے گھر ہو گئے تھے ان کی حالت دگرگوں تھی۔ ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ تاہم وہ یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ جلد کوئی فیصلہ ہوگا اور یہ گوں مگوں کی حالت ختم ہوگی۔ وقت سالوں اور پھر دہائیوں میں بدلتا گیا اور لوگوں کی رائے نہ دریافت کی گئی جو لوگ در بدر تھے ان میں سے کسی نے کہیں اور کسی نے کہیں پناہ لے رکھی تھی اور اس کسمپرسی میں بہت سے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ باقی بچنے والے جوانی سے بڑھاپے پر پہنچ گئے اور بچے جوان ہو گئے اور حالت یہ تھی کہ جائیں تو جائیں کہاں۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔

بدلے ہوئے حالات سے جب یہ اندازہ ہو گیا کہ تنازع کشمیر جلد حل ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بھارت نے اس مسئلہ کو انسانی المیہ قرار دینے کی بجائے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا اور اسے اپنا اٹوٹ رنگ قرار دے دیا۔ پاکستان بھی اپنے موقف پر قائم رہا۔ لہٰذا یہ مسئلہ لاینحل بنتا گیا۔ ان حالات میں مرتا کیا نہ کرتا کے مطابق نوجوانوں نے قوت لایموت کی تلاش میں وسائل ڈھونڈنے شروع کئے۔ پناہ دینے والے

ملک یعنی پاکستان کے وسائل نہایت ہی محدود تھے۔ وہاں روزگار کی تلاش اور پھر اس کا حصول ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ لہٰذا انہوں نے بیرونی دنیا کی طرف نقل مکانی شروع کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ جو بھی اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا اس نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی اپنے پاس بلانا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور اب بھی جاری ہے۔

ہمارے بھائیوں میں سے سب سے چھوٹا بھائی بیروزگاری کے ہاتھوں تنگ رہا۔ اس نے بہت سے کام کئے۔ پاکستان کے طول وعرض میں جو بھی اور جہاں بھی کوئی روزگار میسر آیا اسے اختیار کیا۔ لیکن پھر بھی گذر اوقات مشکل سے مشکل تر ہوتی رہی۔ بالآخر اس نے 1969ء میں ترک وطن کا پختہ ارادہ کر لیا اور جرمنی روانہ ہو گیا۔ کچھ عرصہ جرمنی میں گذارنے کے بعد ڈنمارک چلا گیا۔ مالی حالات تو کس قدر بہتر ہو گئے لیکن وطن اور رشتہ داروں کی یاد جب بے چین کر دیتی تو ان کو ملنے پاکستان آتے اور ہفتہ عشرہ کے قیام کے بعد واپسی ہوتی۔

ادھر حالات بدستور دگرگوں رہے۔ وقت نے ہماری 1948ء کی جوان نسل کو بڑھاپے کی دہلیز پر لا کھڑا کیا لیکن حالات بہتر نہ ہوئے اور نہ ہی مستقبل قریب میں کوئی امید تھی۔ ہماری اگلی پود شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی حالات محسوس کرنے لگی اور یہ سوچنے پر مجبور ہوئی کہ ان کا مستقبل کیا ہے یا کیا ہوگا کیونکہ ہماری خاندانی دھرتی اکھڑ گئیں تھیں یا اکھاڑ دی گئیں تھی ان کی پیوند کاری نصف صدی گذرنے پر بھی نہ ہو سکی تھی۔ لہٰذا انہوں نے ملکوں ملکوں نکل جانے کی طرف توجہ مبذول کر دی۔ پھر یوں ہوا کہ ان میں سے جس کو بھی جس ملک میں قیام کی اجازت ملی وہ وہاں چل دیا۔ وطن یا یوں سمجھیں کہ عارضی وطن یعنی پاکستان ترک کرتے ہوئے اکثر کی زبان سے وحید مانکپوری کا یہ شعر بے ساختہ ادا ہوتا:

ہم نے جب وادی غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

ترک وطن:

ترک وطن کی داستان صدیوں پرانی ہے کبھی ایسا مجبوری کے تحت ہوتا آیا ہے اور کبھی کسی خواہش کی تکمیل کی کوشش میں۔ کبھی ایسی خواہش کی تکمیل ہوتی اور کبھی پیچھے رہ جانے والوں کو کہنا پڑتا:

سونا لینے پی گئے سونا کر گئے دیس
سونا ملا نہ پی پھرے روپا ہو گئے کیس

بہر حال ہماری ترک وطن کی داستان خواہش نہیں بلکہ مجبوری تھی اور اب بھی ہے۔ نوجوان تلاش معاش میں ترک وطن کرتے بلکہ یہ ترک وطن خال خال ہی تھا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ جماعت احمدیہ کو حکومت وقت نے پاکستان میں آئینی طور پر غیر مسلم قرار دیا۔ یہ 1974ء کا واقعہ اور فیصلہ ہے۔ اس فیصلے کا نتیجہ یہ ہوا کہ احمدی معاشرتی دباؤ کے ساتھ ساتھ امتیازی سلوک کے گرداب میں پھنس گئے۔ ان کے لئے ملک کے اندر عرصہ حیات مزید تنگ ہوتا گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ 1982ء کو ان کی اپنی عبادت گاہوں میں اذان دینا حکمًا روک دیا گیا۔ اس کے علاوہ دیگر تمام اسلامی شعار پر عمل کرنے سے حکمًا نہ صرف روک دیا گیا بلکہ ادنیٰ سے ادنیٰ خلاف ورزی پر کم از کم 3 سال جیل کاٹنے کی سزا مقرر ہوئی۔ یہ احکام جماعت کے افراد کے لئے ناقابل برداشت تھے اور یہ مذہبی جبر تھا۔ اس کی وجہ سے احمدیوں کی ایک تعداد ملک چھوڑ نے پر مجبور ہوگئی یا مجبور کر دی گئی۔ تاہم میرا مقصد عمومی بحث نہیں اپنے خاندان کا ذکر مقصود ہے اس لئے اپنے موضوع کی طرف لوٹتا ہوں۔ اس تناظر میں ہمارے خاندان کے نوجوان مثلاً بھتیجے، بھانجے اور بعض صورت میں رشتہ کے پوتوں تک نے بھی ترکِ وطن کیا اور پھر ملکوں ملکوں میں پھیلتے چلے گئے۔ بعض حالات میں کوئی فرد اکیلا ہی کسی ملک میں جاتا اور دوسرا کسی اور ملک میں اور پھر ہر ملک میں قافلے بنتے چلے گئے گویا بقول مجروح سلطان پوری کے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

خاندان کا کوئی فرد جب پردیس روانہ ہوتا تو وہ اکیلا ہی ہوتا۔ باقی گھرانے کے افراد اسے آنسوں کے نذرانے پیش کرتے ہوئے الوداع کہتے اور دوبارہ ملنے کی امید وبیم میں خدا حافظ کہتے اور جانے والا زبان حال اور بعض اوقات زبان قال سے گویا ہوتا:

الوداع اے قافلے والو مجھے اب چھوڑ دو
میری قسمت میں لکھی ہیں دشت کی ویرانیاں

لیکن پھر کیا ہوتا چند سالوں میں اس کے قریبی عزیز یکے بعد دیگرے اس سے آ ملتے اور کارروان

بن جاتا اور بن رہا ہے اور شائد بنتا رہے گا:

جس طرف بھی چل پڑے آبلہ پایانِ شوق
خار سے گل اور گل سے گلستان بنتا گیا
(مجروح سلطان پوری)

وطن سے دور دراز کے ملک یا ممالک کو روانہ ہونے والے کو الوداع کہنے کے لئے اس کے خاندان کے افراد اور دیگر دوست واحباب جمع ہوتے۔ الوداعی دعوت ہوتی۔ غم وانبساط کا ملا جلا ماحول ہوتا۔ دعوت میں شامل افراد اپنے اپنے جذبات کا اظہار کرتے۔ جذبات کے اظہار کے انداز مختلف ہوتے۔ کوئی آنسوں کے نذرانے پیش کر رہا ہوتا، کسی کی زبان پر پردیس جانے والے کی تعریف ہوتی۔ کسی کو موزوں الفاظ نہ ملتے کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کرے اس کا اندازِ خاموشی ہی وداع کا مجسم اظہار ہوتا۔ کوئی کسی مشہور ترانے کے کسی مصرع یا شعر کا سہارا لیتا اور بچپن میں ایک ساتھ کھیلنے اور ایک ساتھ خوشی وغم میں وقت گذارنے والے یوں گویا ہوتے:

چل اڑ جا رے پنچھی کہ اب یہ دیس ہوا بیگانہ
روتے ہیں وہ پنکھ پکھیروں ساتھ تیرے جو کھیلے
جن کے ساتھ لگائے تو نے ارمانوں کے میلے
گیلی اکھیوں سے آج تو دعائیں ان کی لے لے
کس کو پتہ ہے اس نگری میں کب ہو تیرا آنا

کوئی گویا ہوتا:

جانے والے اک نشانی اپنی دیتا جا
جو یہ بھی تجھے منظور نہیں یاد بھی اپنی لیتا جا

کوئی یوں جذبات کا نذرانہ پیش کرتا:

ع جانے والے تیرے قدموں کے نشاں باقی ہیں

محفل وداع میں غالب نواز بھی کم نہ ہوتے۔ غالب کے کلام میں ہر موقع اور محل کے لئے اشعار مل جاتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان تمام حالات میں سے گذرا ہے یا کم از کم انسانی معاشرے کو

پیش آنے والے حالات سے کمال درجہ کا شعور رکھتا تھا۔ ہاں تو کوئی ان میں سے کلام غالب کا سہارا لیتے ہوئے گویا ہوتا:

ع جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

وطن سے رخصت ہونے والا یا رخصت ہونے والے بھی جذبات پر قابو نہ رکھ سکتے اور کسی شعر کا سہارا لیتے یا لیتا اور جذبات میں غرق ہو کر بھیگی آنکھوں اور کپکپاتے ہونٹوں سے گویا ہوتے یا ہوتا۔

ع درو دیوار پر حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

بعض اوقات ایسی محفلیں بھی منعقد ہوتیں بلکہ بعض ایسے حالات سے دوچار ہوتے کہ انہیں وداع کرنے والا کوئی بھی نہ ہوتا بلکہ خود ہی روانہ ہونے والے بھی ہوتے اور روانہ کرنے والے بھی اور وہ یہ کہتے ہوئے روانہ ہو پڑتے:

ع دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

اب حالت یہ ہے کہ ہمارے خاندان کے افراد جن میں سے اب کم و بیش ہر ایک خود ایک کنبہ کا سربراہ بن چکا ہے پاکستان کے علاوہ ڈنمارک، سویڈن، جرمنی، امریکہ، کینیڈا اور انگلینڈ میں موجود ہیں۔ خوشی اور غمی میں سب کا اکٹھا ہونا دشوار ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ لہٰذا ایک دوسرے سے اپنے جذبات کا اظہار ٹیلی فون کے ذریعہ کرتے ہیں۔ ٹیلیفون میل ملاقات کا نعم البدل تو نہیں ہو سکتا اس لئے ایک دوسرے کے بچوں کو آپس میں نہ ملنے کی وجہ سے اجنبیت کا پیدا ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ اس لئے روائتی خاندانی تعلقات کی روایات بدلتی ہوئی ہونے کی صورت میں ایک خلا سا پیدا ہو رہا ہے اس خلا کو کیسے پر کیا جائے۔ یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ لیکن وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ معاشرتی تعلقات میسر ماحول میں پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر ہے۔ اس وقت گروہی، جماعتی اور اپنے وطن کے افراد سے معاشرتی تعلقات پیدا ہوتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ یہ معاشرتی تعلقات آئندہ چل کر کیا شکل اختیار کرتے ہیں یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا ہم کیا پیشگوئی کر سکتے ہیں یا کوئی اس بارے میں کیا رائے دے سکتا ہے۔

باب ہفتم

وے صورتیں ---

1- ماسٹر بشیر احمد صاحب آف چارکوٹ:

برصغیر انگریزی عملداری میں تھا۔ ہند کے وسیع و عریض ملک میں ریاستیں قائم تھیں اور ان پر راجے مہاراجے حکمران تھے۔ ان کی من مانی حکمرانی میں عوام جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتے تھے۔ انہیں ریاستوں میں سے ایک جموں و کشمیر کی ریاست بھی تھی۔ اس کے میلوں میل علاقے سکولوں اور مکتبوں سے خالی تھے۔ وافر قدرتی مناظر، دلفریب وادیاں، گلریز مگر بن باسی دلگیر و دلبر داشتہ۔ جموں کا راجہ وادی کشمیر جنت نظیر انگریزوں کی ہوس زر کو پورا کر کے حاصل کرنے کے بعد مہاراجہ بن چکا تھا اور اب اسے حکومت برطانیہ کی پوری حمایت حاصل تھی اور اب اسے کسی کا کھٹکا نہ رہا تھا۔ عوام کے کسی بھی معقول اور جائز مطالبہ کو نظر انداز کرنا اور دبانا اس کے لئے بہت آسان تھا۔ معاہدہ امرتسر کے مطابق راجے کو انگریز سرکار کا پورا تحفظ حاصل تھا۔ تمام ریاست کی ملکیت کا اسے اور اس کی نسل کو دوامی اختیار حاصل تھا مگر عوام کے حقوق کا اس معاہدہ میں کوئی ذکر نہ تھا۔ چند لاکھ نانک شاہی روپیہ کے عوض میں ایک وسیع و عریض خطہ ارض راجے کو تفویض کرتے ہوئے انگریزی حکومت نے اس بات کو نظر انداز کر دیا تھا کہ اس خطہ کے باسی مسلمان ہیں اور جموں کا حکمران ایک ہندو خاندان ہے۔

جموں کے راجہ نے علاقے کا انتظام سنبھالنے اور اس پر پوری طرح کنٹرول حاصل کرنے کے بعد اسے ایک ذاتی جاگیر بلکہ زر خرید سمجھ کر اس کا انتظام و انصرام شروع کیا۔ عوام کو کالانعام سمجھتے ہوئے ان سے انسانی حقوق تک چھین لئے اور ہمیشہ ہمیش کے لئے انہیں زیر رکھنے کے لئے انہیں تعلیم کی روشنی سے دور رکھنے کی کوشش کی تا کہ انہیں حقوق انسانی کا علم نہ ہو جائے اور وہ اس حق کے طالب نہ بن بیٹھیں۔ عوامی

خزانے سے عوامی بہبود کا تصور حکمران خاندان کی بہبود تک محدود تھا۔سکول اور کالج حکمران خاندان اور ان کے گماشتوں کے لئے وقف تھے اور انہیں کے علاقوں تک محدود تھے۔ یہی حالت دیگر عوامی ضرورتوں کی تھی۔ان حالات میں کہیں کہیں کوئی اہل دل ہمت کرتا اور کسی سوسائٹی یا چند افراد کی مدد سے کہیں سکول یا مکتب قائم کرتا۔تاہم اسے بے حد مشکلات ومصائب سے گذرنا پڑتا۔ایسے ہی باہمت لوگوں میں سے ایک مرد مجاہد نے موضع چارکوٹ تحصیل راجوری ضلع جموں میں بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں انجمن احمدیہ قادیان کی اخلاقی اور غالباً کسی قدر مالی مدد سے ایک مکتب قائم کیا جس نے اس دور دراز اور انتہائی پسماندہ علاقے میں علم کی ضوافشانی شروع کی۔اس مرد مجاہد کا نام نامی بشیر احمد تھا جو بعد میں ماسٹر بشیر احمد کے نام سے یاد کئے جانے لگے اور پھر اسی نام سے اس علاقے میں شہرت پائی۔اگر چہ چارکوٹ میں اور بھی بشیر احمد نام کے افراد تھے لیکن جب ماسٹر کا لفظ ساتھ استعمال ہوتا تو سب اہل علاقہ سمجھ جاتے کہ اس سے کون مراد ہے۔

برصغیر کی تقسیم سے اڑھائی تین سال قبل کی بات ہے کہ میں نے اپنے علاقے کے پرائمری سکول سے پانچویں جماعت اعزاز کے ساتھ پاس کی۔والدین کو میری مزید تعلیم کے حصول کے لئے فکر لاحق تو تھی ہی۔میرے دل میں بھی زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے کی جستجو پیدا ہو چکی تھی۔قرب وجوار میں کوئی مڈل یا ہائی سکول نہ تھا۔لہٰذا موضع چارکوٹ تحصیل راجوری میں قائم مڈل سکول میں داخلہ لینے کا فیصلہ ہوا۔ چونکہ چارکوٹ ہمارے گاؤں سے کئی میل کے فاصلے پر تھا اور روز آنا اور جانا مشکل تھا اس لئے قیام کا مسئلہ حل طلب تھا چنانچہ سکول کے ہیڈ ماسٹر مکرم ماسٹر بشیر احمد صاحب سے مشورہ کے لئے رابطہ کیا تو انہوں نے احمدی ہونے کے ناطے سے بڑی فراخدلی سے اپنے گھر میں قیام کی اجازت مرحمت فرمائی۔چنانچہ ان کے گھر،جو سکول کے قریب ہی تھا، میرا قیام قریباً اڑھائی سال تک رہا۔اس طرح مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ میسر آیا۔میں نے انہیں نہ صرف ایک شفیق استاد پایا بلکہ ایک سرپرست ہونے کی وجہ سے مہربان سرپرست پایا۔ان کی ان دونوں حیثیتوں کو قریب سے دیکھا اور پرکھا۔

استاد ہونے کی حیثیت سے ان کی حیران کن خوبی یہ تھی کہ وہ اکیلے ہی ایک ایسے سکول کو جاری رکھے ہوئے تھے جو درجہ اول سے لے کر درجہ ہشتم تک تعلیم کے زیور سے علاقہ کے نونہالوں کو آراستہ کر رہا تھا۔ان کا طریق یہ تھا کہ درجہ ہشتم کے طلبہ میں سے ذہین اور قابل طلبہ کو باری باری چھوٹے درجہ کے طلبہ کو پڑھانے پر متعین کرتے اور خود اوپر کے درجہ کے طلبا کو پڑھاتے۔یہ ایک نرالہ مگر کارگر طریق تھا جسے وہ بڑی

تندہی اور خوبی سے جاری رکھے ہوئے تھے۔

ماسٹر صاحب کی سرپرست ہونے کی حیثیت بھی اچھوتی اور نمایاں تھی۔مجھے انہوں نے اپنے گھر میں نہ صرف قیام کی اجازت دی اور انتظام فرمایا بلکہ میرے والدین کی خواہش پر سرپرستی اور نگرانی کا بھی پورا ذمہ لیا۔مکتب میں تدریسی اوقات کے بعد مجھے اکثر اوقات اپنے ساتھ رکھتے۔نمازیں مقررہ اوقات پر ادا کرتے اور مجھے بھی باقاعدہ شامل کرتے۔قیام وطعام کی بھی پوری نگرانی فرماتے۔جمعہ کے روز مکتب میں تعطیل ہوتی تھی اس لئے جمعرات بعد دوپہر مجھے اپنے گاؤں جانے کی اجازت ہوتی تھی اور ہفتے کی صبح مکتب میں تدریس شروع ہونے سے قبل پہنچنے کی ہدایت ہوتی تھی۔ان اوقات کی نگرانی کرتے،کوتاہی پر ایک شفیق باپ کی طرح سرزنش کرتے نہ کہ ایک سکول ماسٹر کی طرح۔چونکہ قیام کے ساتھ طعام بھی وہیں تھا اس لئے اس بات کا بھی خیال رکھتے کہ وقت پر مجھے کھانا ملا ہے اور کہ بروقت کھایا بھی ہے۔

ماسٹر صاحب کے ہاں قیام کے دوران عمومی رائج الوقت کے ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل ہوتی رہی۔ان کے ایک نسبتی بھائی اس وقت جامعہ احمدیہ قادیان میں زیر تعلیم تھے،وہ موسمی تعطیلات میں تشریف لاتے تو ان سے قادیان کے عمومی حالات،وہاں کے دینی اور روحانی ماحول پر بات ہوتی۔احمدیہ جماعت کے قیام کی غرض وغائت کا علم ہوتا۔چونکہ وہ وقف زندگی تھے اس لئے وقف زندگی کے اغراض ومقاصد پر بھی ان سے گفتگو ہوتی۔ماسٹر صاحب جماعتی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔کبھی کبھی جمعہ کی نماز بھی پڑھاتے اور مذہبی تعلیمات کے مطابق زندگی گذارنے کی تلقین کرتے اور سامعین کو جماعتی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی تلقین کرتے۔

اگست 1947ء میں برصغیر کی تقسیم کے ساتھ ہی ریاست جموں وکشمیر کا تنازع پیدا ہونے پر ہمارے علاقے میں جنگ کی سی صورت حال پیدا ہوگئی۔جس کے نتیجے میں علاقے کے تمام تعلیمی ادارے بند ہوگئے۔یہ صورت حال قریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہی اور حالات اس قدر خراب ہوگئے کہ ماسٹر بشیر احمد صاحب کو نقل مکانی کر کے پاکستان آنا پڑا اور چک جمال ضلع جہلم اور واہ کینٹ وغیرہ کیمپوں میں جو نقل مکانی کرنے والے کشمیریوں کے قیام کے لئے مقرر تھے کچھ عرصہ قیام پذیر رہنے کے بعد گرمولاں ورکاں، ضلع شیخوپورہ میں رہائش اختیار کی اور وہیں پر انتقال ہوا۔

ماسٹر بشیر احمد صاحب کی یاد مجھے ماضی میں دور تک لے گئی ہے ان کی یاد کے ساتھ ہی ہمالیہ کے

دامن میں واقع اپنی جنم بومی کے مناظر بھی نظروں کے سامنے گھوم رہے ہیں اور دور پرفضا وادی میں کہیں کوئی گڈریا اپنی مخصوص لے الاپ رہا ہے ''باغ بہاراں تے گلزاراں بن یارا کسی کاری'' اور میرا تصور زبان حال سے گویا ہے۔

ہاں دکھا دے اے تصور! وہ صبح و شام تو
دوڑے پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ ہاں تو ماسٹر صاحب کے احسان یاد آتے ہی ان کی مغفرت کے لئے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

2- میرے جامعہ احمدیہ اور جامعۃ المبشرین کے محترم اساتذہ:

مدرسہ و جامعہ احمدیہ اور جامعۃ المبشرین میں تعلیم و تربیت کا عرصہ قریباً نو سال پر محیط تھا۔ اس عرصہ میں جن قابل احترام اساتذہ سے تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا ان میں سے بعض کے اسماء گرامی اور مختصر ذکر درج ہے حضرت مولانا ابو العطاء صاحب، مولانا ارجمند خان صاحب، مولانا صاحبزادہ ابوالحسن قدسی صاحب، مولوی ظہور حسین صاحب مجاہد بخارا، ماسٹر غلام حیدر صاحب، مولوی محمد نذیر صاحب ملتانی، مولوی عطاء الرحمان صاحب، مولانا محمد نذیر صاحب لائلپوری، مولوی ظفر محمد صاحب، ملک سیف الرحمان صاحب۔

ان اساتذہ کے علاوہ اور اساتذہ بھی میری تعلیم کے دوران مذکورہ اداروں سے منسلک ہوتے تھے لیکن میں نے براہ راست ان سے تعلیمی استفادہ نہیں کیا۔ سب اساتذہ محترم ہوتے ہیں اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق مقدور بھر شاگردوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہتے ہیں۔ شاگرد بھی اپنی اپنی قابلیت کے مطابق فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن ہر گل را رنگ و بو دیگر است کے مطابق بعض کی شخصیت اور علمیت متاثر کن ہوتی ہے اور وہ اپنی شخصیت اور علمی ذوق کی وجہ سے شاگردوں کو زیادہ متاثر کرتے ہیں اور شاگرد بھی اپنی قابلیت کے مطابق ان کے رنگ میں رنگین ہونا اور ان جیسا تبحر علمی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے زمانہ طالب علمی میں یہ تفاوت بھی اپنی جگہ موجود تھا اور ہمیں بھی متاثر کرتا رہا۔

مدرسہ احمدیہ اور جامعہ احمدیہ میں دینیات کی بنیادی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو، عربی اور انگریزی

بھی پڑھائی جاتی۔ عربی زبان پر خصوصی توجہ دی جاتی۔ عربی ادب کی بنیادی نثر و نظم کی کتب کے ساتھ گرائمر یعنی صرف و نحو بھی پڑھائی جاتی اور مولوی فاضل جواب عربی فاضل کہلاتا ہے، کے امتحان کی تیاری کروائی جاتی۔ مولوی فاضل کا امتحان اس وقت پنجاب یونیورسٹی لیا کرتی تھی۔ نصاب میں تفسیر قرآن مجید، حدیث، فقہ، ادب عربی نثر و نظم، منطق و فلسفہ، اردو اور انشاء (عربی میں مضمون نویسی) کے مضامین شامل تھے۔ ان مضامین کی تدریس کے لئے ان مضامین میں ماہر استاد مقرر ہوتے جو پوری تندہی اور انہماک سے پڑھاتے۔ اساتذہ سب ہی قابل احترام ہستیاں ہوتی ہیں۔ شاگرد اپنے اساتذہ سے متاثر ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر شاگرد اپنی استعداد کے مطابق استفادہ کرتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر شاگرد اپنے پسندیدہ مضمون یا مضامین کے مطابق اس مضمون کے ماہر استاد یا اساتذہ کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ شاگرد اپنے اساتذہ سے متاثر ہوتے ہیں۔ کسی استاد سے زیادہ اور کسی سے کم۔ کوئی ان میں سے کسی کے لئے مثالی استاد بن جاتا ہے اور وہ اپنے اعمال و افعال اور تبحر علمی میں اس جیسا مقام حاصل کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ یہی کچھ ہماری افتاد طبع میں بھی در آیا تھا۔ اپنے اساتذہ کا مختصر ذکر خیر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ ان محترم اساتذہ کی سیرت کے بعض پہلو کا ذکر ہے۔

مولانا ابوالعطا صاحب جالندھری:

مولانا صاحب سے میری ملاقات اور تعارف اس وقت ہوا جب وہ بحیثیت پرنسپل جامعہ احمدیہ میں خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ ان کی شخصیت قد و قامت کے لحاظ سے منفرد تھی۔ چہرا ابھرا ابھرا سرخ اور اس پر شرعی ڈاڑھی ان کی انفرادیت کو اور بھی نمایاں کرتی تھی۔ لباس قمیص شلوار اور اچکن اور پگڑی ان کی شخصیت کو خوب نکھارتی۔ پرنسپل ہونے کی حیثیت سے کلاسوں کا معائنہ کرتے اور اگر کسی دن کسی کلاس کا پیریڈ خالی ہوتا تو وہ کلاس میں آتے۔ تھوڑی دیر درس دیتے۔ پڑھائی کے سلسلہ میں سوال کرتے۔ مفید مشورے دیتے اور کلاس کو نصائح کرتے۔ صبح کی اسمبلی میں اکثر حاضر ہوتے۔ طلبہ کی رول کال یعنی حاضری کے بعد کسی طالبعلم کو بلاتے اور تقریر کرنے کا ارشاد فرماتے۔ خود مناظر اور مقرر تھے اور فی البدیہہ تقریر کرنے کا ملکہ انہیں حاصل تھا۔ طلبہ سے یہی توقع کرتے تھے کہ ان میں سے بھی ہر ایک کو تقریر کرنے کا ایسا ملکہ حاصل ہوتا اگر کوئی ایسا موقع آ جائے کہ تقریر تیار کرنے کا موقعہ نہ ملے تو بھی وہ تقریر کر سکے اور موقعہ کے

مطابق موضوع اس کے ذہن میں مستحضر ہو جائے۔ عموماً سینئر کلاسوں میں سے کسی طالب علم کو طلب کرتے کہ اسمبلی میں خطاب کرے۔ اور پھر اس کی تقریر کے فوراً بعد اسمبلی میں ہی تقریر کے بارے میں اپنی رائے دیتے کہ آیا وہ معیاری تھی یا نہیں اور اگر نہیں تھی تو کیوں نہیں تھی۔

آپ نے ایک روز اچانک مجھے اسمبلی کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر کرنے کے لئے بلایا۔ جب ڈائس پر پہنچا تو اچانک ذہن میں قرآن کریم کی آیت '' وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی '' (43:40) آ گئی اور میں نے تلاوت کی اور آیت کا ترجمہ ''اور یہ کہ انسان کے لئے اس کے سوا کچھ نہیں (مگر) جو اس نے کوشش کی......'' ترجمے کے بعد سمجھ کے مطابق تشریح کی اور سہارا ملنے پر وضاحت شروع کر دی اور کہا کہ ہر انسان کو اپنے لئے کوئی نہ کوئی پیشہ متعین کر لینا چاہئے مثلاً اگر مربی بننا چاہتا ہے تو اس پیشے کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے ان میں سے ہر ایک میں مقدور بھر مہارت حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے۔ اگر کسی کو استاد کا پیشہ پسند ہے وہ اسے اختیار کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کی تیاری کرے اور پوری مہارت حاصل کرے تب وہ اس علمی میدان میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ اگر طبیب، ڈاکٹر، انجینئر، آرکیٹیکٹ وغیرہ میں سے کوئی لائن اختیار کرنا مقصود ہو تو ان میں مہارت حاصل کرے۔ غرضیکہ جو پیشہ یا لائن اختیار کرے اس میں مہارت حاصل کرنے کی پوری کوشش میں ہی کامیابی کا راز ہے۔ اپنے اختیار کردہ میدان عمل کے لئے پوری محنت اور لگن سے کام لینے کے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس مختصر سی آیت کریمہ میں بنی نوع کو یہی پیغام دیا ہے۔ بات جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا کہ کچھ روز ہوئے میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ کوئی کتاب یا مضمون مطالعہ کرتے ہوئے مصنف کے لکھے ہوئے پر جو اس نے اس موضوع پر لکھا ہے پر اکتفا کرتے ہیں تو آپ اتنا ہی اس موضوع کے بارے میں جان سکیں گے جتنا اس میں لکھا ہے لیکن اگر مطالعہ کے دوران زیر مطالعہ موضوع پر تنقیدی نظر رکھیں گے تو آپ اس موضوع پر دس گنا زیادہ سیکھ سکتے ہیں۔

میں اپنی گذارشات ختم کر کے واپس قطار میں پہنچا تو آپ نے خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ دیکھیں اس طالب علم کے ذہن میں ایک موضوع تھا اور اس نے اچھے یا کم از کم مناسب طریق سے اس نے اسے بیان کیا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی طالبعلم کو بلایا جاتا ہے تو اس کے ذہن میں کوئی بات نہیں ہوتی یا اس وقت اسے یاد نہیں آتی تو وہ معذرت کر کے چلا جاتا ہے۔ استاد کا مقصد شاگردوں کو سکھانا ہوتا ہے۔

وہ کوئی بھی مناسب طریق اپنا سکتا ہے۔ مربیان سلسلہ کو تقریر کا فن آنا چاہئے۔ کیونکہ انہیں اچانک کسی چھوٹے یا بڑے مجمع کو خطاب کرنے کا کسی وقت بھی سامنا ہو سکتا ہے۔ جامعہ کی صبح کی حاضری کی مختصر اسمبلی کے سامنے تقریر کروانے کا یہی مقصد ہے کہ کسی مجمع کو اگر اچانک خطاب کرنا پڑ جائے تو کسی مربی کے لئے مشکل نہ ہو۔

شعائر اسلامی کی پابندی:

حضرت مولانا صاحب خود اسلامی شعائر کے پابند تھے۔ دوسروں کو بھی ایسا ہی دیکھنا پسند کرتے تھے۔ خصوصاً اپنے شاگردوں کو ظاہری معاملات میں بھی ایک نمونہ بنانا چاہتے تھے۔ لباس اور ظاہری رکھ رکھاؤ کے بارہ میں نصیحت فرماتے رہتے تھے۔ سر کے بال لمبے (بودے) رکھنے اور ڈاڑھی ترشوانے یا منڈوانے کے خلاف تھے۔ ہمارے طالب علمی کے زمانے میں فرنچ کٹ ڈاڑھی یعنی صرف ٹھوڑی پر داڑھی رکھنے کا رواج تھا چہرے کے باقی حصہ پر شیو کر دی جاتی تھی۔ ہم جامعۃ المبشرین میں زیر تعلیم تھے کہ ایک مرتبہ مولانا نے جمعرات کے روز صبح اسمبلی کی حاضری کے بعد قطاروں کا چکر لگایا اور ہر طالب علم کے چہرے کا معائنہ کرنے کے بعد واپس تشریف لا کر اعلان کیا کہ کل جمعہ کے روز جامعہ میں چھٹی ہے۔ پرسوں ہفتے کی صبح کو میں ہر طالب علم کے چہرے پر ڈاڑھی دیکھنا چاہتا ہوں کوئی بھی شیو نہ کرے۔ آپ عموماً طلبہ سے یہ توقع رکھنے کے عادی تھے کہ آپ کے ارشاد پر عمل کیا جائے۔ اس لئے اگلے دو روز ایک کے سوا سب نے نہ کی۔ ہفتہ کے روز صبح کی حاضری کے بعد اسمبلی کی قطاروں کا معائنہ کیا تو دیکھا کہ ایک طالبعلم نے ارشاد کی تعمیل نہیں کی۔ جب آپ نے اس سے باز پرس کی تو اس نے اپنی ٹھوڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ دیکھیں ڈاڑھی رکھی ہوئی تو ہے۔ اس پر آپ نے کلرک سے فرمایا جاؤ لائبریری سے ''منجد (عربی ڈکشنری کا نام) لاؤ۔ جب وہ لایا تو اس سے فرمایا لفظ ''اللحی'' نکال کر دیکھو اس کے کیا معانی ہیں۔ اس پر اس طالبعلم نے کہا'' مولانا معاف کیجئے۔ آج تک تو ہم قرآن و حدیث کو مذہبی اور دینی کتب سمجھتے تھے یہ منجد کب سے دینی کتب میں شامل ہوئی ہے۔'' طالب علم کے اس استفسار پر اس وقت تو آپ نے برا منایا۔ لیکن کچھ دیر بعد اسے دفتر میں بلا کر فرمایا کہ میں تمہارے استفسار سے محظوظ ہوا ہوں۔ تاہم یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اپنے شاگردوں کو ظاہری معاملات میں بھی نمونہ بننے کی تلقین اور نصیحت کرتے رہیں۔

حضرت مولانا ارجمند خان صاحب:

مولانا ارجمند خان صاحب ہمیں حدیث پڑھاتے تھے۔ آپ بڑے وجیہہ، بارعب اور دبدبہ والے استاد تھے۔ شاگردوں کو ان کے سامنے بات کرنے کا حوصلہ کم ہی ہوتا تھا۔ تدریس کا حق ادا کرنا ان پر ختم تھا۔ مسئلہ کو سمجھانے اور ذہن نشین کرانے کے لئے ہر ممکن دلیل دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے تھے۔ حدیث میں کوئی فقہ کا مسئلہ آجاتا تو اسے مثالیں دے دے کر خوب سمجھاتے اور کوشش فرماتے کہ ہر طالب علم اسے کلاس ہی میں سمجھ لے۔ بلکہ ازبر کر لے۔ اگر دیکھتے کہ کوئی طالب علم پوری طرح متوجہ نہیں یا دلچسپی سے نہیں سن رہا تو اس سے مخاطب ہوتے اور اس پر اپنی نظریں جما کر پورے جوش اور ولولے سے سارا مضمون ایک مرتبہ پھر دہراتے اور ایسی صورت پیش آنے پر ان کا سرخ وسفید چہرہ اور بھی سرخ ہو جاتا۔

پروفیسر ہونے کے علاوہ وہ ہمارے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ بھی کچھ عرصہ رہے۔ فجر کی نماز کے لئے روازنہ ہوسٹل کے طلبا کو بیدار کرتے۔ ان کی گرجدار آواز سے طلبا جلد بیدار ہو کر نماز ادا کرنے کے لئے چل پڑتے۔

حضرت ابوالحسن قدسی صاحب:

حضرت صاحبزادہ ابوالحسن قدسی صاحب ہمیں عربی ادب کی ابتدائی کتب پڑھاتے تھے۔ ان کا ادبی ذوق اچھا تھا۔ آپ کم گو تھے۔ طبیعت میں شرمیلا پن تھا۔ بہت کم ہنستے تھے۔ مسکراتے وقت بھی ہاتھ کی انگلیاں ہونٹوں پر رکھ لیتے تھے۔ سبق پوری دلچسپی سے پڑھاتے، کسی طالبعلم کی شرارت سے بہت ناراض ہوتے۔

آپ حضرت سید عبد اللطیف صاحب رئیس علاقہ خوست، افغانستان کے چھوٹے فرزند تھے۔ جب جماعت احمدیہ میں شمولیت کی وجہ سے سید عبد اللطیف صاحب سنگسار ہوئے تو اس وقت حضرت قدسی صاحب کی عمر پانچ چھ سال کی تھی۔ بظاہر اس حادثہ کا اثر زندگی بھر ان کی طبیعت پر رہا۔ شاید ان کی کم گوئی اور کم آمیزی کی وجہ بھی اسی حادثہ کا اثر ہو۔ تاہم آپ بڑی گہری سوچ کے مالک تھے۔ اردو اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ ان کے اشعار اردو روزناموں کی زینت بنتے رہتے تھے۔ ان میں سوز وغم کی چاشنی بہت نمایاں ہوتی تھی۔ ہم تعلیم کی تکمیل کے بعد کارزار حیات سے نبرد آزما تھے اور وہ تدریس سے ریٹائر تھے۔

کبھی کبھار جب برسرِ راہ ملاقات ہوتی تو بڑے تپاک سے ملتے۔ خیر خیریت کے جملوں کے بعد گویا ہوتے چند دنوں سے طبیعت ناساز ہے۔ صحت ہونے پر بھرپور طریق سے کام شروع کروں گا۔ کام غالباً ان کی مراد لکھنے لکھانے کا کام ہوتا تھا۔

حضرت مولوی ظہور حسین صاحب:

عاقل کا یہاں پر کام نہیں وہ لاکھوں بھی بے فائدہ ہیں

(کلام محمود)

دینی تعلیم کے حصول کے لئے ستمبر 1948ء میں جب مدرسہ احمدیہ میں داخلہ لیا تو ہمارے ابتدائی اساتذہ میں سے حضرت مولوی ظہور حسین صاحب بھی تھے۔ مولوی صاحب موصوف مجاہد بخارا کے تعارف سے متعارف تھے اور ہم سب ان کی عزت کرتے تھے۔ وہ پہلے شخص تھے جو جماعت احمدیہ کی طرف سے پیغام حق پہنچانے کے لئے دنیا کے اس حصہ میں تشریف لے گئے تھے جہاں بخارا کی مقدس بستی ہے۔ بخارا، سمرقند اور تاشقند سنٹرل ایشیا کے ملک ازبکستان (Uzbekistan) کے مشہور مقامات ہیں۔ حضرت امام بخاری جو حدیث کے مشہور اور صحیح ترین احادیث پر مشتمل کتاب کے مدون بخارا کے رہنے والے تھے۔ اسی مناسبت سے ان کی تصنیف کا نام بھی بخاری شریف ہے اس لئے بخارا کا نام مسلمانوں میں مشہور ہے۔

مدرسہ اور جامعہ احمدیہ ان دنوں احمد نگر نزد ربوہ قائم تھا۔ دور دراز سے آنے والے طلبہ کے لئے ہوسٹل میں قیام وطعام کا بندوبست تھا۔ مولوی صاحب موصوف کے تدریس کے فرائض کے ساتھ ساتھ ہوسٹل میں قیام پذیر طلبہ کی تربیت کے نگران بھی تھے۔ اس جہت سے ہمارا ان سے ابتدائی واسطہ پڑنا قدرتی امر تھا۔ وہ قریباً ہر روز صبح ومساء ہوسٹل تشریف لاتے طلبہ کو مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے جانے کی تلقین کرتے حتی کہ جب انہیں اندازہ ہو جاتا کہ طلبہ مسجد کی طرف روانہ ہو چکے ہیں تو وہ خود ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوتے۔

مولوی صاحب موصوف کی شہرت ایک استاد ہونے سے زیادہ مجاہد بخارا ہونے کی تھی۔ چنانچہ ہم استاد اور پھر مجاہد بخارا ہونے کے لحاظ سے ان کی تعظیم وتکریم کرتے اور خصوصیت سے یہ بات مدنظر رہتی کہ انہیں وہاں کیسے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ ہماری کلاس کو صرف ونحو پڑھایا کرتے تھے۔ یہ مضمون ہمارے لئے قریباً نیا تھا۔ اردو گرامر کا تو کسی حد تک تعارف تھا لیکن عربی کی صرف ونحو اور خصوصاً صَرف کے

بارے میں اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ بہت دقیق ہوتی ہے صرف کے بارے میں مشہور مقولہ ہے

دعیٰ یدعُو دے نٹھے
اساں ہل دھنیدے ڈٹھے

مولوی صاحب عربی صرف کی ابتدائی کوئی گردان ہمیں زبانی یاد کرنے کا ارشاد فرماتے اور اگلے روز کلاس میں سنانے کے لئے کہتے۔ اگلے روز اگر کوئی طالبعلم پوری نہ سنا سکتا یا سنانے میں مشکل محسوس کرتا تو فرماتے 'نالائق' کل ضرور یاد کر کے آنا۔ اسی طرح کلاس میں اگر کوئی طالبعلم سبق کی طرف پوری توجہ نہ دیتا تو فرماتے 'نالائق' کتاب پر نظر رکھو اور توجہ سے سنو۔ اس سے زیادہ میں نے کلاس میں ان سے ڈانٹ ڈپٹ نہ سنی اور نہ دیکھی۔

کلاس میں اگر کوئی طالبعلم بخارا کے بارے میں دریافت کرتا تو مختصر طور پر بعض واقعات کا ذکر کرتے اور آخر میں فرماتے کہ آپ بھی اس میدان کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ عملی میدان میں کسی وقت بھی مشکل حالات پیدا ہو سکتے ہیں لہٰذا ذہنی طور پر مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ فرمایا کرتے کہ حضرت مصلح موعودؓ نے مجھے دنیا کے اس حصہ میں جانے کا ارشاد فرمایا۔ روانگی سے قبل وہاں پہنچنے پر جو مشکلات تھیں ان کا بھی تذکرہ فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ وہاں پہنچ کر بھی مشکل حالات پیش آنے اور ان کا سامنا کرنے کا امکان ہے۔

مولوی صاحب موصوف کی جامعہ احمدیہ میں تدریس جاری تھی کہ ہماری کلاس جامعۃ المبشرین میں چلی گئی اور وہاں سے تعلیم کی 1957ء میں تکمیل کے بعد مجھے میدان عمل میں مختلف ممالک میں جاتے رہنے کی وجہ سے ملاقات کم سے کم تر رہی۔ آخری بار زیمبیا سے 1979ء کے آخر میں واپسی پر چند بار زیارت نصیب ہوئی۔ یہ 1980ء، 1981ء کا زمانہ تھا۔ موصوف کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد مسجد اقصیٰ بذریعہ تانگا تشریف لاتے اور وہاں ملاقات ہو جاتی۔

ماسٹر غلام حیدر صاحب:

طویل القامت، نکھرتا ہوا سفیدی مائل چہرہ، شلوار قمیص میں ملبوس، سر پر دستار، چال ڈھال متوازن، آواز تحکمانہ لیکن نصیحت آموز، چہرے پر اکثر مسکراہٹ سجائے۔ یہ تھے ہماری دینی تعلیم کے آغاز کے وقت کے اور ہوسٹل مدرسہ و جامعہ احمدیہ میں ہمارے قیام کے وقت کے سپرنٹنڈنٹ ماسٹر غلام حیدر

صاحب۔ آپ انگریزی زبان کی تدریس کے استاد بھی تھے۔ ہوسٹل میں قیام پذیر طلبہ کے قیام وطعام کی نگرانی کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی نگرانی بھی ان کے سپرد تھی یا یوں سمجھیں کہ وہ اسے بھی اپنی ذمہ داری تصور کرتے تھے۔ طلبہ کی باجماعت نمازوں میں شمولیت کو یقینی بنانے کی ہمیشہ کوشش کرتے تھے۔

مدرسہ اور جامعہ بیشتر جماعتوں کی انگریزی زبان کی تدریس بھی ان کے ذمہ تھی۔ تدریس کی گھنٹی بجتے ہی کلاس میں آتے۔ نصاب کے مطابق پڑھاتے۔ طلبہ کی توجہ پڑھائی کی طرف قائم رکھنے کے لئے نصابی کتاب پر نظر کے ساتھ ساتھ طلبہ پر بھی نظر رہتی۔ ہماری کلاس کے کمرہ پر کلاک لگا ہوا تھا جو ہر گھنٹے کے پورا ہونے پر بجتا تھا۔ گھڑیال کی اس آواز پر بسا اوقات شعوری طور پر طلبہ کو وقت کی قدر کرنے کی طرف توجہ دلانے کے لئے یہ شعر پڑھتے:

غافل تجھے گھڑیال دیتا ہے یہ منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

گھٹیالیاں ضلع سیالکوٹ میں جماعت کا ہائی سکول قائم ہونے پر سکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہونے پر وہاں چلے گئے۔ اپنی قیمتی نصائح اور طرز تکلم کی یاد ہمارے پاس چھوڑ گئے۔ کافی عرصہ بعد اور آخری بار ان سے ربوہ میں برسر راہ ان سے اچانک ملاقات ہوئی تو میرا نام لے کر خیریت پوچھی۔

مولوی محمد نذیر صاحب ملتانی:

مولوی محمد نذیر صاحب ملتانی مدرسہ کی ابتدائی جماعتوں کو حدیث پڑھاتے تھے۔ جامعہ میں اس وقت دو استاد ایک ہی نام یعنی محمد نذیر تھے اس لئے ہم امتیاز کے لئے ان کے نام کے ساتھ ملتانی کا اضافہ کر دیا کرتے تھے یا غالباً وہ خود بھی اپنے نام کے ساتھ ملتانی لکھتے تھے کیونکہ وہ ضلع ملتان کے رہنے والے تھے۔ حدیث شریف کی ابتدائی کتب نصاب میں شامل تھیں۔ ابتدائی کتب سے مراد انتخابات پر مشتمل کتب جیسے ریاض الصالحین وغیرہ ہیں۔ آپ بڑی توجہ سے پڑھاتے۔ دوران تدریس اگر کوئی مسئلہ واضح نہ ہوتا یا وہ سمجھتے کہ طلبہ پوری طرح سمجھ نہیں پائے تو اگلے روز مسئلہ کی وضاحت کرتے اور ساتھ ہی اپنے حافظہ کا ذکر شکایت کے رنگ میں کرتے بسا اوقات بات ذہن میں موجود ہوتی ہے لیکن فوری طور پر مستحضر نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ بتاتے کہ کسی حادثہ میں زخمی ہوئے تھے۔ صحتیاب ہو گئے لیکن حافظہ پر معمولی سا اثر باقی رہا۔

آپ کافی زندہ دل تھے طلبہ میں گھل مل جاتے۔ کچھ عرصہ ہمارے ہوسٹل کے ٹیوٹر بھی رہے۔ طلبہ کی تربیت کا خاص خیال رکھتے۔ تقسیم برصغیر کے خون آشام واقعات سے گذرے تھے اور ان واقعات کو گذرے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ مدرسہ اور جامعہ کے اکثر طلبہ کی تعداد بھی نقل مکانی کر کے آنے والوں کی تھی۔ اکثر ضروریات زندگی کی کمی یا عدم دستیابی کا شکار تھے۔ آپ کو اس بات کا شدید احساس تھا۔ لہٰذا طلبہ سے بسا اوقات انفرادی طور پر دریافت فرماتے کہ کسی ایسی چیز کی ضرورت تو نہیں جس کے بغیر گذارہ مشکل ہو۔ اگر ایسا ہے تو بتاؤ تا انتظامیہ کو آگاہ کیا جا سکے۔

مولوی عطاء الرحمان صاحب:

مولوی عطاء الرحمان صاحب کے سپرد عربی گرائمر یعنی صرف اور نحو کی تدریس ہوتی تھی۔ ہمارے طالب علمی کے زمانہ میں صرف ونحو عربی ادب کے ساتھ نہیں پڑھائی جاتی تھی بلکہ الگ ایک مضمون کی حیثیت سے تدریس ہوتی تھی۔ صرف نحو کے نصاب نحو کی کتاب کا نام 'الفیہ' تھا۔ یہ کتاب منظوم تھی اور نحو کے قریبًا تمام قواعد کو ایک ہزار عربی زبان کے اشعار کا جامہ پہنایا گیا تھا اور نحو کی مشکل ترین کتاب سمجھی جاتی تھی۔ آپ جب تدریس کی غرض سے کلاس میں آتے تو مکمل خاموشی چھا جاتی تمام طلبا کتاب کھول کھول کر ہمہ تن پڑھائی کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ پڑھائی شروع ہو جاتی۔ آپ اپنی کتاب کھول لیتے اور آپ کی توجہ بظاہر کتاب پر مرکوز ہوتی اور نظریں بھی کتاب پر جمی ہوتیں لیکن اگر کوئی طالب علم غیر شائستہ حرکت کرتا تو فوراً اسے اس کا نام لے کر مخاطب کرتے۔ پوری کلاس حیران رہ جاتی کہ آپ کی نظریں تو کتاب پر تھیں طالبعلم کی حرکت یا سبق کی طرف عدم توجگی کا آپ کو کیسے علم ہو گیا۔ اکثر کلاس پر اس انداز سے نظر ڈالتے کہ کوئی بھی بولنے کی جرأت نہ کرتا۔

آپ بھی تقسیم برصغیر کے خون آشام حالات سے متاثر تھے۔ احمد نگر، تحصیل چنیوٹ کی مختصر بستی میں نو تعمیر کردہ مسجد کے صحن کے ملحق ہی ایک چھوٹا سا کمرہ ان کی قیام گاہ تھا۔ کمرہ کی حالت خستہ تھی نا پختہ اینٹوں کی دیواریں اور کانوں کی چھت تھی۔ چھت کی اونچائی بھی معیاری نہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ انسانی رہائش کے لئے تعمیر نہیں ہوا تھا بلکہ جانوروں کو سردیوں کی پناہ گاہ کے لئے بنایا گیا ہوگا اور ان کے لئے ہی استعمال ہوتا ہوگا۔

آپ اسی مسجد میں باقاعدگی سے پانچ وقت کی نماز ادا کرتے ایک مرتبہ مؤذن نماز کے قیام پر اقامت کہتے ہوئے درمیاں میں بھول گی اس نے دوبارہ اقامت کہی اور پھر بھول گیا۔ اس پر کسی اور مقتدی نے اقامت کہی اور نماز ادا ہوئی۔ نماز کے بعد آپ نے مؤذن کو جس کا نام فرمان علی تھا مخاطب کر کے پوچھا ''فرمان علی آج کیا ہوا تم اقامت ہی بھول گئے'' جبکہ روزانہ پانچ وقت سال ہا سال کہتے آئے ہو۔ ان کے اس استفسار پر فرمان علی گویا ہوا مولوی صاحب یہ تو اقامت کی بھول تھی جو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ پٹواری نے کسی دستاویز پر مجھے دستخط کرنے کے لئے کہا تو میں اپنا نام ہی بھول گیا اور سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا لکھوں۔ مؤذن کی یہ دلچسپ بات آپ اکثر مزے لے لے کر سنایا کرتے اور ساتھ ہی مسکراتے یا تھوڑا بہت ہنس لیا کرتے۔ آپ نے نہایت باوقار طبیعت پائی تھی۔ تصوف کی اصطلاح کے مطابق کم گو اور کم آمیز تھے۔ فرائض کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی انہیں گوارہ نہ تھی۔

حضرت مولانا قاضی محمد نذیر صاحب لائلپوری:

حضرت مولانا قاضی محمد نذیر صاحب لائلپوری ہمیں منطق اور فلسفہ پڑھایا کرتے تھے۔ وہ طلبا سے بالکل گھل مل جایا کرتے تھے اور بڑے دوستانہ رنگ میں شاگردوں کے سوالات کے جوابات دیا کرتے۔ ان کی پوری کوشش ہوتی کہ طلبا کی تسلی ہو جائے۔ اور اگر کسی روز جواب میں تشنگی محسوس کرتے تو گھر جا کر مزید مطالعہ اور تحقیق کرتے۔ اور اگلے روز کلاس میں تشریف لا کر اس کا نچوڑ پیش کر کے طلبا کی پوری تسلی کرا دیتے۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ اپنے شاگردوں کو پوری طرح دلائل سے لیس کر کے میدان میں بھجوائیں تا کہ وہ جرأت اور دلیری سے ہر مشکل سوال کا جواب دے سکیں۔ اور جو تدریس کے لئے منتخب ہوں ان کی عملی بنیاد بھی ٹھوس دلائل پر استوار ہو تا وہ اپنے شاگردوں کی تسلی اور تشفی کرا سکیں۔

ایک مناظرے کا منظر:

ہمارے استادوں میں سے قاضی محمد نذیر صاحب فاضل لائلپوری اچھے مناظر اور حاضر دماغ تھے۔ علوم میں سے انہیں منطق اور فلسفہ میں خاصا درک حاصل تھا۔ منطق کے اسباق کو مثالیں دے دے کر طلبہ کو ذہن نشین کرواتے۔ کلاس میں آتے تو سپاری یا کوئی دوسری چیز چبا رہے ہوتے اور ختم ہونے پر ڈبیہ

کھول کر منہ میں ڈالتے۔ ان کے اس طرزِ عمل پر بعض طلبہ ہنس پڑتے تو بڑے تحمل سے فرماتے انجن کو چلنے کے لئے ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے جبتک ایندھن نہ ڈالا جائے انجن رواں دواں نہیں رہ سکتا۔

مناظروں میں بھی خاصا ملکہ رکھتے تھے۔ جذبات کی رو میں بہ جانے کی بجائے حاضر دماغی سے کام لیتے۔ ایک مناظرے کے دوران مدمقابل مناظر نے اور بہت سی تکلیف دہ باتوں کے ساتھ یہ بھی کہا احمدی مناظر تنخواہ دار ہوتے ہیں۔ وہ سچی بات کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں وہ تو وہی بات کہیں گے اور اسی عقیدہ کی پرچار کریں گے جو انہیں تنخواہ دینے والے کہیں گے اور اسی عقیدہ کا پرچار کریں گے جو ان کا عقیدہ ہے۔ انہیں انجمن احمدیہ سے تنخواہ ملتی ہے لہذا جو انجمن والوں کے عقائد ہیں یہ ان کا ہی دفاع کریں گے۔ جب قاضی محمد نذیر صاحب کی جواب دینے کی باری آئی تو اطمینان سے جواب میں کہا اور خوب کہا کہ ”اگر ہمارے رزق کا وسیلہ اور ذریعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی آمد اور ان کی قائم کردہ جماعت ہے اور ہم ان کی حمائت کر کے اسے حاصل کرتے ہیں تو آپ کے رزق کے حصول کا ذریعہ بھی وہی ہیں کیونکہ آپ ان کی مخالفت کر کے رزق حاصل کر رہے ہیں۔ آپ لوگ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی مخالفت میں مجمع لگاتے اور کتب شائع کرتے ہیں اور اس طرح عوام سے چندے اور دیگر مراعات حاصل کرتے ہیں۔“ حاضرین ان کے اس برجستہ جواب سے بہت محظوظ ہوئے اور آپ کی مناظرانہ قابلیت کو پسند کیا۔

مولانا ظفر محمد صاحب ظفر:

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو برو
شرح دہم، غم ترا، نکتہ بہ نکتہ مو بمو

یہ ایران کی شاعرہ قرۃ العین طاہرہ کی فارسی غزل کا پہلا شعر ہے۔ یہ غزل چند اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مشہور غزل کی غنائیت اس قدر دلکش ہے کہ ایک مرتبہ سن لیں تو دل چاہتا ہے کہ بار بار سنی جائے اور اگر ممکن ہو تو خود گنگنائی جائے۔ ہمارے عربی ادب کے استاد مولانا ظفر محمد ظفر تھے اور پردرج شعر پہلی بار ان سے سنا تھا۔ آپ نہایت ہی لطیف سخن فہمی کا ذوق رکھتے تھے۔ دوران تدریس کبھی کبھی کسی نہایت ہی عمدہ غزل یا نظم کا ذکر کرتے اور ساتھ ہی اس غزل یا نظم کا کوئی عمدہ سا شعر سناتے اور اگر زیادہ شعر یاد ہوتے تو بھی سنانے سے گریز نہ کرتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک روز کلاس میں ادب عربی کی مشہور کتاب

’متنبی‘ پڑھاتے ہوئے کسی شعر کی تشریح کرتے ہوئے قرۃ العین طاہرہ کی اس غزل کے اشعار سنائے تھے اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس معروف شاعرہ نے کس کے فراق یا فراق کا تصور کرتے ہوئے یہ غزل لکھی تھی۔

مولانا ظفر صاحب صرف شعری ذوق ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ خود بھی شاعر تھے اور بہت عمدہ شعر کہتے تھے۔ کسی شاعر کا جب ذکر کرتے تو یوں محسوس ہوتا کہ بے لاگ تبصرہ اور شاعر کی شاعری تک محدود ہے اس کی ذات یا اس کے اعتقادات سے کوئی غرض نہ ہوتی۔ صرف یہ ذکر رہتا کہ وہ کس پایہ کا شاعر ہے۔

ہمارے عربی فاضل کے نصاب، عربی ادب میں حماسہ اور متنبی دونوں کتابیں شامل تھیں۔ حماسہ تو زمانہ جاہلیت وغیرہ میں متعدد شاعروں کی مختلف اوقات اور مواقعہ پر تحریر کردہ نظموں پر مشتمل ہے۔ اس میں بہادری کی تعریف کی گئی ہے۔ اس لئے اس کتاب میں بہادری خصوصاً جنگوں میں بہادری دکھانے پر مشتمل نظمیں زیادہ ہیں اور عشق و محبت پر مشتمل بہت کم نظمیں ہیں اور غنائیت کسی کسی میں ملتی ہے اسی طرح فلسفہ بھی بہت شاذ ہے۔ جبکہ ’متنبی‘ ایک ہی شاعر کے شعروں کا دیوان ہے۔ اس میں ادبی چاشنی اور رومانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مولانا ظفر صاحب جب متنبی پڑھاتے تو بسا اوقات اس مشہور و معروف شاعر کا مقابلہ علامہ اقبال سے فرماتے اور کہتے کہ جس طرح علامہ اقبال آج کے دور میں ہمہ جہتی کا شاعر ہے اسے سب ہی پسند کرتے ہیں یعنی بحیثیت شاعر بالکل اسی طرح ’متنبی‘ بھی اپنے وقت کا بہت بڑا شاعر تھا اور سب اسے پسند کرتے تھے۔ حتی کہ عربی ادب میں آج تک اس نوعیت اور انداز کا شاعر اس کے مقابل کا کوئی سامنے نہیں آیا۔

ملک سیف الرحمان۔ مثالی استاد۔ آئیڈیل۔ استاد:

شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ذوق جستجو دامن گیر ہوا۔ اس ذوق کی تکمیل کے ذرائع کی ابھی تلاش ہی تھی کہ برصغیر میں آزادی کی شمع روشن ہونے کے ساتھ ہی ہندوستان تقسیم ہو گیا اور تقسیم کے ساتھ ہی مسئلہ کشمیر بھی پیدا ہو گیا۔ حصول تعلیم کے ذرائع مسدود ہو گئے۔ ذوق جستجو نے ساتھ نہ چھوڑا۔ کشاں کشاں نو زائدہ خداداد مملکت پاکستان میں آ گئے۔ زندگی کے مستقبل کے راستہ کا تعین پہلے سے ہو چکا تھا۔ عرض گزار ہوئے کہ مزید تعلیم کا حصول سابقہ ذرائع سے لیکن نہ رہا۔ حکم ہوا احمد نگر ضلع جھنگ چلے جائیں اور جامعہ احمدیہ میں داخلہ لے لیجئے۔ افتاں و خیزاں منزل پر پہنچے۔ داخلہ لیا، نیا ماحول تھا، نئے چہرے تھے۔ رفتہ رفتہ

روشناس ہوتے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد ایک دبلے لیکن طویل قامت شخص، رنگ نکھرتا ہوا، داڑھی خشخشی، پروقار دھیمی چال چلتے ہوئے کلاس روم میں داخل ہوئے۔ کلاس روم کیا تھا ایک متروکہ حویلی کا طویل کمرہ جو غالبًا ماضی قریب میں حیوانوں کے سردی گرمی سے بچانے کے لئے تعمیر کیا گیا ہوگا۔ جملہ طلبا اس نئے آنے والے استاد کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔ ''تشریف رکھئے'' کی دھیمی آواز کانوں سے بمشکل ٹکرائی۔ گفتگو کا آغاز ہونے پر معلوم ہوا کہ ان کے ذمہ ادارے نے ''علم صرف'' کی تدریس کی ہے اور کہ ''علم صرف'' کا تعلق عربی زبان کی گردانوں اور صیغہائے گوناگوں سے ہوتا ہے۔ آغاز تدریس میں ہی ارشاد ہوا صرف کی گردانیں یاد کرنی پڑتی ہیں۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ یہ گردانیں کامل اساتذہ کی نگرانی میں یاد کی ہیں اور کبھی کبھی موسم گرما کی شدت میں بیلوں سے چلنے والے کنویں کی ''ٹنڈ'' کے نیچے بیٹھ کر یاد کی ہیں۔ تدریس علم صرف کی گھنٹی ختم ہوئی۔ معلم علم صرف اسی پروقار انداز اور دھیمی چال کے ساتھ کلاس روم سے چلے گئے۔ یہ تھی ہماری پہلی ملاقات ملک سیف الرحمان صاحب سے جو آگے چل کر محنت، کام میں لگن، بے لاگ خدمت، فرائض کی ادائیگی کے اعتبار سے جماعت میں انمٹ نقوش چھوڑ گئے اور حضرت ملک سیف الرحمان کے نام سے یاد کئے گئے اور کئے جاتے ہیں۔

حضرت ملک سیف الرحمان صاحب نے چند دن پڑھانے کے بعد کلاس میں آنا چھوڑ دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جماعت نے ایک نیا کالج ''جامعۃ المبشرین'' کے نام سے جاری کیا ہے اور وہ اس میں پڑھانے پر متعین ہوئے ہیں۔ جامعہ احمدیہ سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد ''جامعۃ المبشرین'' میں داخل ہوئے تو ملک صاحب سے ملاقات ہوئی لیکن بطور مدرس ''علم صرف'' کے نہیں بلکہ ''فقہ اور تصوف'' کے مدرس کے طور پر۔ ہم اس وقت عمر کے اس حصہ میں سے گذر رہے تھے جس عمر میں عمومًا ہر طالب علم کو کسی نہ کسی ''Ideal'' کی تلاش ہوتی ہے۔ آئیڈیل کی تلاش کے مقاصد مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ہم نے جس مقصد کے لئے زندگی کی راہ متعین کی تھی اس کے لئے اس کا مطلب صرف علم میں ترقی کرنے کے لئے کسی نمونہ کی تلاش تھی اور اس کے لئے اساتذہ میں سے ہی کوئی ہوسکتا تھا۔ ہماری نظر انتخاب نے انہیں منتخب کیا اور ان کے طور طریقے خصوصًا مطالعہ وغیرہ میں اپنانے کی ناکام کوشش میں مصروف ہوگئے۔

تعلیم سے فراغت ہوگئی۔ میدان عمل شروع ہوگیا۔ بیرون پاکستان خدمت کرنا نصیب میں لکھا تھا۔ تین چار سال بعد واپسی ہوئی۔ ملاقات ہو جاتی بلکہ دعوت پر گھر بلاتے۔ پھر روانگی ہو جاتی۔ اسی طرح

کئی سال گذر گئے۔ 1979ء میں زیمبیا سے واپسی پر جامعہ میں تعیناتی ہوگئی۔ اس وقت حضرت ملک صاحب جامعہ احمدیہ کے پرنسپل تھے۔ تدریسی فرائض کے علاوہ جامعہ کے احاطہ کی ''باغبانی'' کی نگرانی بھی حصہ میں آئی۔ جامعہ کی موجود ''ٹک شاپ'' کی جانب شمال ایک کیاری میں ''کماد کی فصل'' تھی۔ ایک روز تقریبًا تین یا چار بجے بعد دوپہر مالی بھاگا بھاگا آیا کہ طلبا نے فصل تلف کر دی ہے اور کیاری میں بیٹھے گنے چوس رہے ہیں۔ آکر دیکھا تو واقعی فصل ختم ہونے کے قریب تھی۔ چند پودے کھڑے تھے۔ مالی سے کہا کہ یہ بھی کاٹ دو۔ کچھ تم لے جاؤ اور چند ایک ملک صاحب کے گھر پر انہیں دے دو۔ مقصد یہ تھا کہ اس طرح انہیں علم ہو جائے گا کہ کماد کی کیاری ختم ہوگئی ہے لیکن انہوں نے گنے واپس کر دئے۔ کیوں واپس کئے اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہم سب پر چھوڑ دیا۔

3- چند متاثر کن شخصیات کا ذکر

حاجی ماسٹر امیر عالم صاحب:

میانہ قد، گھنی داڑھی، شلوار قمیص اور واسکٹ میں ملبوس پُر وقار شخصیت کے حامل ماسٹر امیر عالم صاحب سے پہلی ملاقات جولائی یا اگست 1950ء میں کوٹلی ضلع میر پور میں ہوئی۔ ماسٹر صاحب کا فرزند محمود جو عرف عام میں محمود میر پوری کے نام سے جانا جاتا تھا اور ہماری طرح جامعہ احمدیہ کا ہی طالبعلم تھا ہم ایک ہی ہوسٹل میں قیام پذیر تھے اس لئے شناسائی تھی۔ ہر سال موسمی تعطیلات میں وہ کوٹلی اپنے گھر چلا جاتا۔ ہمارے کچھ رشتہ دار بھی اس زمانہ میں عارضی طور پر کوٹلی میں قیام پذیر تھے۔ میں بھی کبھی ان سے ملنے موسمی تعطیلات میں جاتا تو محمود سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ 1952ء کی موسمی تعطیلات کوٹلی میں گذارنے کا پروگرام بنا تو وہاں قیام کے دوران ماسٹر صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع میسر آیا۔ کوٹلی کی احمدیہ مسجد کے وہ امام بھی تھے چونکہ گرمی کا موسم تھا اسلئے ان دنوں عصر کی نماز کی ادائیگی کے بعد وہ بسا اوقات مسجد کے صحن میں تشریف فرماتے۔ مجھے چونکہ دو ماہ کی رخصتیں تھیں اس لئے میں بھی کبھی کبھار ان کے پاس بیٹھ جاتا تا کوئی نصیحت آموز بات ان سے سن سکوں۔

کوٹلی میں قیام کے دوران ایک آدھ مرتبہ وہاں کے بڑے بازار سے گذرنے کا اتفاق ہوا تو دیکھا

[illegible] رمضان پر اپنے بھائی کے [illegible] کار ہے اس پر مجھے کچھ خوشگوار حیرت ہوئی اور ارادہ کرلیا کہ ماسٹر صاحب سے [illegible] وں کا کہ طلبا کو موسم گرما کی طویل تعطیلات تو اس لئے ہوتی ہیں کہ وہ سیر و تفریح اور آرام [illegible] یں اور تازہ دم ہو کر دوبارہ دل جمی سے پڑھائی میں مشغول ہوں لیکن آپ نے اپنے بیٹے کو رخصتوں میں بھی کام پر لگایا ہوا ہے۔ چنانچہ ایک روز حسب معمول ماسٹر صاحب کو جب عصر کی نماز کے بعد مسجد کے صحن میں اکیلے ہی تشریف فرما دیکھا تو میں نے اوپر بیان کردہ خیالات کا اظہار ان سے کر دیا۔ انہوں نے پورے انہماک اور توجہ سے میری بات سنی اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے گویا ہوئے۔ ''برخوردار سانپ پورے دن یعنی چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک مرتبہ ڈنگ مارتا ہے یا مار سکتا ہے لیکن فارغ انسان بیسیوں مرتبہ انسانوں کو ڈستا ہے'' مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ سانپ اگر کسی کو ڈس لے تو 24 گھنٹے تک اس کا زہریلا مواد ختم ہو جاتا ہے اور اس عرصہ میں ڈسنا بے کار ہوگا لیکن انسان کا غیر مصروف دماغ متواتر دوسروں کو تکلیف دہ باتوں کے ذریعہ انہیں تکلیف دینے میں مصروف رہتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میرا بیٹا بے کار رہے اور بے کار باتیں سوچتا رہے کار آمد کام اور پھر کام میں انسان کی بھلائی ہے یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کو رخصتوں کے ایام میں بھی کام پر لگایا ہوا ہے''۔ ماسٹر صاحب کی اس مدلل گفتگو اور سانپ کے زہر کی مثال سے میں بہت متاثر ہوا اور یہ عہد کیا کہ کبھی بیکار وقت نہیں گذاروں گا بلکہ کام سے اگر وقت بچ جائے اور فراغت ہو تو کلام الٰہی کی تلاوت میں یا کسی اور علمی کتاب کے مطالعہ میں صرف کروں گا۔

ماسٹر امیر عالم سے اس کے بعد بھی جب کبھی موقع ملا ملاقات رہی۔ اور مشفقانہ اور نصیحت آموز گفتگو ہوتی رہی۔ ان کا یکم جنوری 1967ء کو انتقال ہوا۔ اس وقت میں گی آنا جنوبی امریکہ میں مصروف عمل تھا روزنامہ الفضل ربوہ کے ذریعہ ان کی وفات کا علم ہوا۔ اوپر مذکور سبق آموز گفتگو کے علاوہ بہت سی باتیں اور ملاقاتیں ایک ایک کر کے یاد آتی گئیں اور دل کی گہرائیوں سے ان کی مغفرت کی دعائیں کیں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین۔ مرحوم ایک صاحب کشف بزرگ، خوش الحان اور بلند آواز موذن تھے۔ انہیں کوٹلی جماعت کا سب سے پہلا احمدی ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور اس لحاظ سے گویا وہ کوٹلی جماعت کے بانی تھے۔

کرنل ڈاکٹر محمد رمضان:

ریٹائرڈ کرنل محمد رمضان صاحب نے 29 دسمبر 80ء کو حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اخبارات نے وفات کی خبر دیتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ آپ پاکستان کے مشہور ریڈیالوجسٹ تھے۔ پاکستان غانا اور زیمبیا میں خدمات بجالانے کے بعد حال ہی میں زیمبابوے تشریف لے گئے اور وہاں مصروف عمل ہی تھے کہ اجل نے آلیا۔ آپ کی شخصیت گونا گوں صفات کی حامل تھی۔ آپ سماجی کاموں میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔

کرنل رمضان صاحب 1915ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں ہی تعلیم حاصل کی تکمیل تعلیم کے بعد فوج سے منسلک ہو گئے۔ 1940ء میں سلسلہ احمدیہ میں شامل ہوئے۔ دوسرے جنگ عظیم میں مشرق وسطیٰ میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ فلسطین میں قیام کے زمانہ کو اکثر یاد کیا کرتے تھے۔ فوج میں ملازمت کے دوران لاہور پشاور اور راولپنڈی میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ 1961ء میں ریٹائر ہونے کے بعد غانا مغربی افریقہ کی حکومت نے ان کی خدمات حاصل کر لیں۔ وہاں پر آپ بطور ریڈیالوجسٹ نو سال تک خدمات سرانجام دیتے رہے۔ غانا سے 1972ء زیمبیا میں تشریف لے گئے اور نومبر 1980ء تک یونیورسٹی ٹیچنگ ہسپتال لوساکا میں بطور ریڈیالوجسٹ خدمات سرانجام دیتے رہے۔ نومبر کے شروع میں زیمبابوے کی حکومت نے آپ کی خدمات حاصل کر لیں لیکن زندگی نے زیادہ عرصہ وفا نہ کی اور وہاں پر 29 دسمبر کی رات کو حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے داعی اجل کو لبیک کہا۔

جماعتی خدمات:

کرنل صاحب موصوف سے میرا تعارف 1975ء کے اواخر میں زیمبیا ہوا۔ زیمبیا میں میری تعیناتی بطور انچارج مشن کے ہوئی تھی۔ مشن ابتدائی دور میں سے گذر رہا تھا اور اس کے پاس کوئی ایسی معقول جگہ نہ تھی جس میں روزمرہ کے کام سرانجام پاسکیں۔ جماعت نے فیصلہ کیا کہ ان مشکلات پر قابو پانے کے لئے کرنل صاحب کی خدمات حاصل کی جائیں چنانچہ آپ کو مشن کے کاموں کو احسن طریق پر چلانے کے لئے صدر منتخب کیا گیا اس عہدہ کو آپ نے کم و بیش پانچ سال تک بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا۔

اور مشن کے حالات کو سدھارنے کے لئے ہر ممکن تعاون کیا۔ 76ء کے شروع میں کسی ذریعہ سے جماعت زیمبیا کو معلوم ہوا کہ بعض معاندین زیمبیا مشن کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ جماعت کی مجلس عاملہ کی میٹنگ بلائی گئی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات سامنے آئی کہ مشن کو قائم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا اور بعض غیر معمولی مشکلات کی وجہ سے جماعت کے کام نمایاں طور پر ذرائع ابلاغ وغیرہ کے ذریعہ سے سامنے نہیں آسکے جن کی بنا پر افسران بالا کو مشن کے اغراض ومقاصد اور خدمات کا علم ہو اس لئے مناسب ہوگا کہ صدر مملکت ڈاکٹر کینث کاونڈا (Dr. K. Kaunda) سے ملاقات کر کے ان کو جماعت کی ان نمایاں خدمات سے آگاہ کیا جائے جو وہ افریقہ کے مختلف ممالک میں بذریعہ سکولوں اور ہسپتال [illegible] ی ہے۔ اور یہ کہ جماعت اس ملک میں بھی انہیں خطوط پر کام کرنا چاہتی ہے اور اس کی ملک کو اشد ضرورت ہے۔ چنانچہ صدر صاحب کی خدمت میں درخواست ارسال کر دی گئی۔ چند دن بعد ان کی طرف سے ملاقات کے وقت اور تاریخ کی اطلاع موصول ہوگئی۔ یکم اپریل 76ء کو کرنل صاحب کی سرکردگی میں ملاقات ہوئی۔ صدر صاحب کو قرآن مجید اور اسلام پر چند کتب پیش کیں اور مشن کے اغراض ومقاصد ان کے سامنے رکھے۔ صدر صاحب نے مشن کے کاموں کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ اس ملک میں بھی مسلمان ہیں اور ان کی اس مقدس کتاب اور دوسری کتب پڑھ کر مجھے علم ہوگا کہ مَیں ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کروں۔ دوران گفتگو کرنل صاحب نے غانا مغربی افریقہ میں اپنے قیام کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہاں جماعت عوام کی کیسے خدمت کر رہی ہے ساتھ ہی اپنے مخصوص انداز گفتگو میں ایسی باتیں بھی کرتے گئے جن سے صدر صاحب محظوظ ہوتے رہے جب بھی کوئی اہم کام درپیش ہوتا تو کرنل صاحب اس کے لئے تیار رہے۔ مشن کے اہم کاموں کے سلسلہ میں بسا اوقات ملک کی نامور شخصیتوں کو ملنا پڑتا اگر کرنل صاحب ساتھ ہوتے تو ایک گونہ تسلی ہوتی کہ وہ اپنی حاضر دماغی اور لطیف ظرافت کی وجہ سے کوئی نہ کوئی ایسا نکتہ ضرور نکال لیں گے جس سے ماحول خوشگوار رہے گا۔ ایک مرتبہ زیمبیا کے وزیر اعظم کو وفد کی صورت میں ملنے گئے۔ ان کی خدمت میں اسلام پر چند کتب پیش کیں۔ گفتگو کے دوران اسلام میں تعدد ازدواج کی اجازت پر بات چل نکلی۔ ان دنوں افریقہ کے ایک سربراہ کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے ریفریجریٹر میں ایک نسوانی سر پایا گیا ہے جس کا مقصد حرم کے نسوانی کرداروں کو ہراساں کرنا ہے وزیر موصوف نے ان کا ذکر چھیڑا۔ ظاہر ہے ان کا اشارہ تعدد ازدواج کی اجازت کے غلط استعمال کی طرف تھا ہم علمی بحث کر رہے تھے کہ اجازت کن حالات میں ہے مگر

وزیر موصوف مصر تھے کہ اجازت سے غلط فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ کرنل صاحب نے یہ کہہ کر کہ جواز کے بغیر بھی بہت کچھ روا رکھا جا سکتا ہے جس کی مذہب اجازت نہیں دیتا گفتگو کا رخ بدل دیا ان کا اشارہ جنوبی افریقہ اور روہ ڈیشیا میں ان دنوں رونما ہونے والے واقعات کی طرف تھا جس کی بظاہر عیسائی مذہب اجازت نہیں دیتا۔ وزیر موصوف بھانپ گئے اور کہنے لگے کہ یہ درست ہے کہ روڈیشیا میں سفید فام اقلیت جس قسم کا سلوک سیاہ فام اکثریت کے خلاف روا رکھے ہوئے ہے اس کا عیسائی مذہب میں کہیں بھی جواز نہیں۔

مذہبی عقائد کا دلیرانہ اظہار:

کرنل صاحب اپنے مذہبی عقائد کا اظہار ہر محفل ومجلس میں بڑی دلیری سے کرتے کسی موقع کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے بلکہ کسی نہ کسی انداز میں جماعت کی دینی خدمات کا اظہار کر جاتے یا اگر کسی دینی موضوع پر بات ہوتی تو حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے ارشادات کا حوالہ دے دیتے۔ یا آپ کے جانشینوں میں سے کسی کا قول پیش کر دیتے۔ چونکہ آپ کا انداز بیان دلپذیر ہوتا اس لئے کوئی بھی برا نہ مناتا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ لوسا کا (Lusaka) میں پاکستانی کمیونٹی کی کوئی بھی مجلس ہو آپ کی شمولیت کے بغیر نامکمل ہوتی۔ نجی محفلوں میں آپ کی شمولیت ان کی رونق کو دوبالا کر دیتی۔ زیمبیا میں پاکستانیوں نے ایک سوسائٹی زیمبیا پاکستان دوستی کی انجمن کے نام سے قائم کی ہوئی ہے کرنل صاحب اس سوسائٹی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔

مشن کی مالی اعانت:

کرنل صاحب اکثر اس خواہش کا اظہار کیا کرتے کہ زیمبیا مشن کے پاس مستقل جائیداد ہونی چاہئے جس میں مسجد، مہمان خانہ، دفتر اور لائبریری ہو وسائل کی کمی کی وجہ سے یہ ممکن نہ تھا کہ صدر صاحب سے ملاقات جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کے دوران کرنل صاحب نے جب یہ ذکر کیا کہ مشن کی طرف سے کچھ عرصہ قبل ایک جلسہ کا انتظام ہوا تھا جس میں انسانیت پر اسلام کے احسانات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ نیز یہ کہ اس جلسہ میں دیگر مذاہب کے نمائندوں نے بھی اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کیا تھا اس پر صدر صاحب نے فرمایا کہ اس جلسہ کی کارروائی کی رپورٹ اور تقاریر کا ریکارڈ اگر موجود ہو تو ان کو بھجوایا جائے چنانچہ

جو مواد موجود تھا بذریعہ ڈاک صدر صاحب کی خدمت میں بھجوا دیا گیا اور ساتھ ہی درخواست کی گئی کہ مشن کو اپنے کام احسن طریق پر سرانجام دینے کے لئے مناسب جگہ کی ضرورت ہے جواب میں بلدیہ لوساکا کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت ملی۔ بلدیہ نے درخواست پر ہمدردانہ غور کیا اور ایک وسیع قطعہ دینے پر تیار ہوگئی۔

کرنل صاحب کی اشد خواہش تھی کہ ان کے 'لوساکا' میں قیام کے دوران اس پر تعمیر کا کام شروع ہو جائے۔ لیکن بلدیہ کی تعمیرات کے لئے شرائط موجود نہ ہونے کی وجہ سے تعمیر کا سلسلہ شروع نہ ہو سکا۔ کرنل صاحب نے اپنی اس خواہش کو گذشتہ سال اس طرح پورا کیا کہ ایک خالص افریقن محلّہ میں گیارہ صد کواچے یعنی چودہ ہزار روپے کی لاگت سے ایک قطعہ اراضی جس پر کچھ تعمیر بھی تھی خرید کر مشن کو دیا تا کہ اس محلّہ میں مقیم احمدی باجماعت نمازیں ادا کر سکیں اور ان کے بچوں کے لئے تعلیم و تربیت کا کام باحسن طریق ہو سکے۔

محترم کرنل صاحب غانا میں اپنے قیام کا اکثر ذکر کرتے۔ محترم صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب وکیل التبشیر تحریک جدید کے دوروں اور ان کے نتیجہ میں مشن کی روز افزوں ترقی کا بھی ذکر اکثر کرتے۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ غانا میں مشن کی کسی زیر تعمیر عمارت کے سلسلہ میں جب تحریک ہوئی کہ صاحب استطاعت دوست ایک ایک کمرے کا خرچ دیں تو انہوں نے بھی ایک کمرے کے لئے خرچ دیا تھا۔ کرنل صاحب چندوں کی ادائیگی میں بڑے محتاط تھے۔ اور بڑے التزام سے ہر ماہ خود مشن میں آ کر چندہ ادا دیا کرتے تھے۔

ادبی ذوق:

کرنل صاحب کو اردو ادب سے اچھا خاصا لگاؤ تھا۔ ادبی کتب اور رسائل کی جستجو میں رہتے اور جہاں بھی اچھی کتاب یا رسالہ دیکھتے پڑھنے کے لئے حاصل کر لیتے۔ ان کی دلچسپی صرف پڑھنے تک محدود نہ ہوتی بلکہ مناسب موقعہ پر استعمال پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ 76ء کا ذکر ہے 'لوساکا' میں تعزیت کے لئے چند احباب ایک گھر میں جمع تھے ایسے موقعوں پر عموماً لوگ ادھر ادھر کی باتوں میں لگ جاتے ہیں اور اصل مقصد پس پشت ڈال دیا جاتا ہے مگر کرنل صاحب با مقصد اور موقعہ کے مطابق بات کرنے کو ترجیح دیتے موقع کی مناسبت سے ان کی زبان سے یہ شعر ادا ہوا۔

ے زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے ان ہی اجزا کا پریشاں ہونا

شعر سن کر احباب محظوظ بھی ہوئے اور ساتھ ہی زندگی اور موت کے فلسفہ پر باتیں شروع ہو گئیں۔ بعض صاحب ذوق حضرات جب فلسفہ کی موشگافیوں میں دور تک نکل گئے تو کرنل صاحب نے قرآن حکیم کی یہ آیت پڑھی

تَبَارَکَ الَّذِی بِیَدِہِ الْمُلْکُ وَ ھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیءٍ قَدِیْرُ نِ الَّذِی خَلَقَ
الْمَوْتَ وَ الْحَیَاۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔(78:3)

یعنی وہ خدا جس کے قبضہ میں بادشاہت ہے اور وہ ہر ایک ارادہ کو پورا کرنے والا ہے اس نے موت اور زندگی کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ آزمائے کہ تم میں سے کون سا زیادہ اچھا عمل کرنے والا ہے۔

خدا تعالیٰ کی کلام میں پیش کردہ اس حکیمانہ موت و حیات کی تشریح سن کر احباب خاموش ہو گئے۔

مکرم ڈاکٹر افضل احمد صاحب عدنی کی والدہ کی وفات کی اطلاع لوساکا میں ملی۔ احباب تعزیت کے لئے ان کے گھر پر جمع تھے۔ کرنل صاحب بھی تشریف لے آئے کچھ دیر بیٹھے رہے پھر انگریزی میں یوں گویا ہوئے

'Death is inevitable but when ever comes
it seems too early.

یعنی موت ایک حقیقت ہے لیکن جب بھی آتی ہے یوں لگتا ہے بہت جلد آ گئی

ان کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ مکرم ڈاکٹر صاحب کی والدہ اگرچہ کم و بیش طبعی عمر کو پہنچنے پر فوت ہوئی تھیں لیکن پھر بھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ بہت جلد دنیا کو خیر باد کہہ گئی ہیں۔

کرنل صاحب درس قرآن مجید میں باقاعدہ حاضر ہوتے۔ مذہبی امور میں دلچسپی لیتے۔ اخبار الفضل کا مطالعہ کرتے اور زیر اثر غیر از جماعت دوستوں کو بھی سلسلہ کا لٹریچر اور اخبار پڑھنے کے لئے دیتے۔ اور دوبارہ ملاقات پر ان سے استفسار کرتے کہ زیر مطالعہ لٹریچر کو انہوں نے کیسا پایا اس طرح جائزہ لیتے رہتے کہ آیا وہ کتب پڑھتے بھی ہیں یا یوں ہی لے جاتے ہیں۔ ان کے دوستوں کو احساس رہتا کہ ملاقات پر کرنل صاحب ان سے دریافت کریں گے لہٰذا وہ ضرور پڑھتے۔

کرنل صاحب نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے کامیاب اور بھرپور زندگی گذاری۔ بچوں کی تعلیم و

تربیت کا بھی پورا خیال رکھا۔ چنانچہ ان کے تین بیٹوں میں سے دو ڈاکٹر ہیں اور ایک انجینئر ہے۔ دو بیٹیاں ہیں جو تعلیم یافتہ اور شادی شدہ ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کرنل صاحب کی روح کو جنت الفردوس نصیب کرے اور ان کے بچوں کو ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے خدمتِ دین کی توفیق دے۔

مولانا عطاء اللہ کلیم صاحب:

برصغیر کی تقسیم سے دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک پاکستان کے نام سے قائم ہو چکا تھا۔ تبادلہ آبادی کے روح فرسا مناظر بھی رونما ہو چکے تھے۔ جماعت کو نئے مرکز کے قیام کی تلاش تھی۔ بالآخر ایک بے آب و گیاہ قطعہ اراضی کو مرکز بنانے کے لئے انتخاب کیا گیا۔ جہاں اب ربوہ کا خوش منظر اور روح پرور شہر آباد ہے۔ اس انتخاب کے عمل میں آتے ہی اس کے قرب و جوار میں جماعت کے زیر انتظام چلنے والے تعلیمی اداروں کو منتقل کرنے کا جب فیصلہ ہوا تو جامعہ احمدیہ کے لئے احمد نگر اور تعلیم الاسلام ہائی سکول کے لئے چنیوٹ کا انتخاب ہوا۔ 54 سال قبل احمد نگر کی یہ حالت نہ تھی جو اب ہے۔ ماہ و سال کی گردش کے ساتھ اس کی حالت بہتر سے بہتر ہوتی گئی ہے اور ہوتی جا رہی ہے۔ اس وقت کے حالات کے مطابق جامعہ احمدیہ کے لئے احمد نگر میں متروکہ املاک کے دو حویلی نما مکان حاصل کئے گئے۔ ایک میں جامعہ کا ہوسٹل قائم ہوا اور دوسرے میں تدریس کا عمل شروع ہوا۔ ستمبر 1948ء میں مجھے بھی اس ادارہ جلیلہ میں دینی تعلیم کے حصول کے لئے داخلہ لینے کی سعادت نصیب ہوئی۔

غالباً 1949ء کے موسم خزاں کی بات ہے کہ کسی کام سے احمد نگر کے لاری اڈہ کی طرف جانا ہوا تو وہاں ایک بارلیش نوجوان دیدہ زیب لباس میں ملبوس کسی بس کی آمد کے انتظار میں کھڑا ہے۔ سر پر سفید پگڑی ہے۔ اشارے سے مجھے اپنی طرف بلا کر کسی کام کی فرمائش کرتا ہے، اب یاد نہیں کہ وہ کیا کام تھا، تاہم مجھے اس خوش پوش نوجوان سے مل کر خوشگوار سی مسرت ہوئی۔ وقت گذرتا رہا پھر ان سے کافی دیر تک کوئی ملاقات نہ ہوئی اور اگر کبھی سر راہ ہوئی بھی تو علیک سلیک تک محدود رہی۔ تا آنکہ کلیم صاحب مربی سلسلہ بن کر بیرون پاکستان چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد تکمیل کے بعد بطور مربی سلسلہ میں بھی سیرالیون مغربی افریقہ چلا گیا۔ 1962ء میں سیرالیون احمدیہ مشن نے وہاں کے جلسہ سالانہ کے موقع پر مغربی افریقہ جہاں جہاں ہمارے مشن قائم تھے کے انچارج مربیان کو جلسہ میں شمولیت کی دعوت دی۔ چنانچہ غانا سے کلیم صاحب اور

لائبیریا سے مبارک احمد ساقی صاحب جلسہ میں شمولیت کے لئے تشریف لائے۔ اس موقعہ پر انہیں قریب سے دیکھنے کا موقعہ میسر آیا۔ اس جلسہ پر جو انہوں نے تقریر کی وہ بھی متاثر کن تھی اور اس سے صاف عیاں ہوتا تھا کہ انہیں خدمت دین کا کس قدر جذبہ ہے۔

ہمارے خدمت کے میدان الگ الگ رہے۔ تا آنکہ 1970ء میں میری گی آنا جنوبی امریکہ سے واپسی ہوئی تو مولانا کلیم صاحب اس وقت حدیقۃ المبشرین جو نیا نیا قائم ہوا تھا بطور سیکرٹری کے خدمات سرانجام دے رہے تھے اور اس وقت اس ادارے کو پول (Pool) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ اس وقت کہاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ایک روز سر راہ ملاقات ہونے پر دریافت کیا کہ آج کل کہاں خدمت سپرد ہے مسکراتے ہوئے فرمایا چھپڑ کی نگرانی کرتا ہوں۔ میں حیران کہ یہ کیا فرما رہے ہیں میری حیرانگی اور تعجب کو محسوس کرتے ہوئے فرمایا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو انگریزی زبان سے نابلد ہو یا پھر پنجابی زبان کا صحیح مزاق نہیں رکھتے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ چونکہ گی آنا سے چار ساڑھے سال بعد واپسی ہوئی تھی اور چار ماہ کی رخصت پر تھا رخصتیں ختم ہونے کو تھیں کہ ایک روز سر راہ ملاقات ہوئی۔ عرض کیا رخصتیں ختم ہو رہی ہیں کہاں خدمت سپرد کرنی ہے۔ چونکہ ان دنوں کسی مربی کی جب رخصت ختم ہوتی تھی تو وہ حدیقہ میں رپورٹ کرتا تھا اور پھر نئی تقرری ہوتی تھی۔ پہلے تو مذاقاً فرمایا "جب آؤ گے نپٹ لیں گے"۔ بعد میں سنجیدگی سے فرمایا علمی ذوق رکھتے ہو کوئی کام اس کے مطابق ہی نکل آئے گا۔ یا پھر تلاش کرلیں گے۔ چنانچہ رخصتیں ختم ہونے پر جامعہ احمدیہ میں بطور استاد کے تقرری کے احکامات موصول ہوئے۔

ہمدردانہ مشورہ:

ملکوں ملکوں خدمت دین کرنے کی بنا پر وسیع تجربہ رکھتے تھے اور ساتھ ساتھ زمینی حقائق کے بھی قائل تھے۔ اس لئے مناسب اور صائب مشورہ دینے سے کبھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ 1975ء میرا تقرر بطور مربی زیمبیا کے لئے ہوا۔ ان دنوں کلیم صاحب ربوہ میں ہی تھے۔ ایک روز سر راہ ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ معلوم ہوا ہے کہ تم زیمبیا جا رہے ہو اور پھر ذرا توقف کے بعد گویا ہوئے زیمبیا کا مشن نیا ہے اور صرف چند سال ہوئے قائم ہوا ہے۔ وہاں سے ان دنوں ڈاکٹر محمد رمضان صاحب جو وہاں حکومت زیمبیا کے ملازم کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہاں مشن کے حالات تسلی بخش

نہیں۔ایک چھوٹے سے کمرے میں مشن کا دفتر قائم ہے اور مربی صاحب کی رہائش بھی اسی کمرے میں ہے اور جو مربی صاحب اس وقت وہاں کام کر رہے ہیں وہ بڑی کسمپرسی کی حالت میں جوں توں کر کے کام نباہ رہے ہیں۔ جماعت کی تعداد بھی تھوڑی ہے اس لئے روانگی سے قبل وکیل التبشیر تحریک جدید مرزا مبارک احمد صاحب سے مل کر وہاں کے حالات بتائیں اور ان سے ضروری ہدایات حاصل کرلیں۔ یہ نہ ہو کہ بعد میں ناقابل حل مشکل سے دوچار ہو جاؤ یا ابتلا میں پڑ جاؤ۔ میاں صاحب انہیں دنوں یورپ کے طویل دورے سے واپس تشریف لائے تھے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سب حالات معلومہ عرض کئے اور حسب مشورہ کلیم صاحب ضروری ہدایات لے کر زیمبیا کے لئے روانہ ہوا اور کلیم صاحب کچھ عرصہ بعد امریکہ روانہ ہو گئے۔

دعائیں پڑھنے کی تلقین:

ایک مرتبہ زیمبیا سے کلیم صاحب کی خدمت میں خط لکھا اور زیمبیا روانگی سے قبل ان کے بروقت مشفقانہ اور صائب مشورہ دینے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا کہ زیمبیا میں دعوت الی اللہ کا کام پوری لگن سے جاری ہے لیکن باوجود اس کے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا اور جماعت کی ترقی تسلی بخش نہیں شب و روز یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ دعوت الی اللہ کے کام میں کیسے وسعت پیدا ہو اور اس کے لئے کیا طریق اختیار کیا جائے۔ حسب منشا ترقی نہ ہونے کی وجہ سے طبیعت میں شگفتگی پیدا نہیں ہوتی اس خط کے جواب میں انہوں نے تسلی دیتے ہوئے لکھا کہ آپ کام کرتے جائیں نتیجہ خدا پر چھوڑ دیں وقت آنے پر خود مخلوق کی توجہ حق قبول کرنے کی طرف مائل ہو گی اور آپ کی محنت اور لگن ثمر آور ہو گی۔ ساتھ ہی ایک دعا لکھ بھیجی۔ یہ دعا پہلے بھی یاد تھی اور کبھی کبھی دیگر دعاؤں کے ساتھ اس کا ورد بھی رہتا تھا لیکن خط ملنے کے فوراً بعد روزمرہ استعمال کی ڈائری میں نقل کر لی تا بار بار نظر پڑتی رہے نیز یہ کہ ایک ہمدرد مربی نے اس کے بار بار پڑھنے کی تلقین کی ہے اور پھر آج تک کے ربع صدی ہونے کو آئی یہ دعا برابر پڑھتا ہوں اور ساتھ ہی کلیم صاحب یاد آجاتے ہیں اور ان کے لئے بھی دعا کرتا اور اب ان کی مغفرت کے لئے دعا کرتا ہوں۔

امریکہ آنے پر یہاں کے جلسہ سالانہ پر ملاقات ہوئی اسی محبت سے گلے لگایا جیسا کہ ان کا دستور تھا۔ پھر 1999ء میں یو۔ کے (U.K) کے جلسہ سالانہ پر جانے کا اتفاق ہوا تو کیا دیکھتے ہیں کہ جن عزیز مربی عبدالمومن طاہر صاحب کے ہاں ہمیں قیام کرنا تھا۔ وہ بھی وہیں پہلے سے قیام پذیر ہیں۔ حسب دستور

بڑی شفقت سے ملے اور جلسے کے دوران اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرتے رہے۔

اگست 2000ء میں جماعت احمدیہ امریکہ کی طرف سے بمقام زائن (Zion) نزد شکاگو بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اس کانفرنس میں کلیم صاحب بھی شامل تھے وہاں پر ان سے ملاقات ہوئی اس سے قبل ان کی طبیعت کی خرابی کا علم ہو چکا تھا پوچھنے پر بتلایا کہ دل کا عارضہ ہوا تھا اب طبیعت بہتر ہے۔ اس کانفرنس میں شمولیت کے لئے ہوائی جہاز کا سفر اختیار کیا ہے تا معلوم ہو سکے کہ ہوائی جہاز میں سفر سے کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی کیونکہ جرمنی جانے کا ارادہ ہے اور وہاں سے پھر پاکستان بھی جانا ہے۔ الحمدللہ کہ ہوائی سفر سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی اب انشاءاللہ پہلے جرمنی اور پھر وہاں سے پاکستان جاؤں گا۔ یہ ان سے میری آخری ملاقات تھی۔ وہ سفر پر روانہ ہو گئے اور یہ سفر ان کا آخری سفر ثابت ہوا اور وطن پہنچ کر آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئے گویا:

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

محترم نسیم سیفی صاحب:

مکرم نسیم سیفی صاحب کی وفات حسرت آیات کی خبر بذریعہ 'روزنامہ الفضل' ہم پردیسیوں تک پہنچی۔ بعد میں ان کی خدمات سلسلہ اور سوانحی خاکہ بھی پڑھا اور ایک اور مضمون بھی ان کے بعض اوصاف کے ذکر میں اخبار مذکور کے صفحات کی زینت بنا۔

گذشتہ سال اگست میں ان سے ملاقات ہوئی خوش باش نظر آئے اور ہمیشہ کی طرح خندہ پیشانی سے ملے اور یہ ہماری آخری ملاقات ثابت ہوئی کیونکہ اس کے بعد جلد میں امریکہ چلا آیا۔ مجھے اس وقت ان کی سوانح حیات لکھنا مقصود نہیں اور نہ ہی مجھے اس بارہ میں زیادہ معلومات حاصل ہیں۔ محترم سیفی صاحب سے ایک لمبا عرصہ میل ملاقات رہی اور ان کی وہ چند باتیں بیان کرنا مقصود ہے جو قارئین الفضل کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہیں۔

تعارفی ملاقات:

مجھے اچھی طرح تو اب یاد نہیں کہ ان سے پہلی اور تعارفی ملاقات کب ہوئی۔ صرف اتنا یاد ہے کہ

ان دنوں وہ نائیجیریا میں ایک لمبا عرصہ جماعتی خدمات بجالانے کے بعد واپس ربوہ آئے تھے۔اور ہماری ملاقات دفاتر تحریک جدید میں ہوئی تھی اور میں نے ایک طالبعلم کی حیثیت سے ان سے عملی میدان میں کامیابیوں کی داستان سننی چاہی کیونکہ میں ابھی نیا نیا میدان عمل میں اترا تھا اور ان کی داستان میرے لئے راہنمائی کا باعث ہوسکتی تھی۔انہوں نے بڑی محبت اور نرمی سے باتیں کیں اور مجھے یہ تاثر ملا کہ ان سے کسی وقت اور کسی موضوع پر بھی کھل کر بات کی جاسکتی ہے۔اس ملاقات کی جو باتیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں وہ کچھ اس طرح تھی کہ میدان عمل کی کامیابی کا راز محنت اور مسلسل محنت، مرکز کی ہدایات پر عمل کرنے اور دعاؤں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کرنے کی مسلسل درخواست میں مضمر ہے۔

تقریر کے بارے میں نظریہ:

ایک مرتبہ تقریر کرنے کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی فرمانے لگے ایک قسم کی گفتگو ہے۔جس طرح گفتگو کرتے ہوئے آدمی گھبراتا نہیں اس طرح مقرر اگر یہ سمجھے کہ میں گفتگو کر رہا ہوں ایک موضوع پر بات ہو رہی ہے تسلسل قائم ہو اور توازن سے بولتا جائے تو یہی تقریر ہے۔

شاعری:

خود تو پُر گو شاعر تھے ہی۔دوسروں کو بھی تلقین کرتے کہ شعر کہنے کی طرف اگر رجحان ہے تو ضرور اسے عملی شکل دیں۔22/23 سال پرانی بات ہے میں زیمبیا میں جماعتی خدمات پر مامور تھا اور سیفی صاحب سیرالیون میں خدمات بجالا رہے تھے۔زیمبیا میں ان دنوں پاکستان سے گئے ہوئے چند احباب نے مل کر ''زیمبیا پاکستان فرینڈ شپ ایسوی ایشن'' (Zambia Pakistan Friendship Association) قائم کی ہوئی تھی۔کبھی کبھار اس کی میٹنگ ہوتی اور اس کی کارگردگی رسالے کی صورت میں چھپوائی بھی جاتی۔اس رسالے کے لئے مجھے بھی کچھ لکھنے کے لئے کہا جاتا۔ایک مرتبہ جبکہ یوم پاکستان کی مناسبت سے رسالہ کو ترتیب دیا جا رہا تھا انتظامیہ نے کچھ لکھنے کی فرمائش کی تو میں نے چند اشعار لکھے جو چھپ گئے۔رسالہ کی کچھ کاپیاں مجھے بھی ملیں اور میں نے دیگر ڈاک کے ساتھ ایک کاپی سیرالیون مشن کو بھی بھجوادی۔79 میں جب میں ربوہ واپس آیا تو مکرم سیفی صاحب فرمانے لگے مشق سخن جاری رکھیں اور پھر

بتایا کہ سیرالیون میں انہیں رسالہ ملا تھا جس میں میرے چند اشعار تھے۔پھر انہوں نے اپنی شاعری کے آغاز کی داستان بتاتے ہوئے بتایا کہ جب انہوں نے شعر لکھنے شروع کئے تو کچھ نہ کچھ لکھ کر لاہور کے مختلف رسالوں کو بھجوادیا کرتے تھے کہ کوئی نہ کوئی تو چھاپے گا اور پھر جب ایک رسالے میں اپنے شعر چھپے ہوئے دیکھے تو خوشی کی انتہا نہ رہی اور پھر شعر لکھنے کی ہمت بندھ گئی اور یقین ہو گیا کہ کلام قابل پذیرائی ہے۔یہ ساری بات بتانے کا ان کا مقصد یہی تھا کہ لکھنے کی مشق خواہ شاعری ہی کیوں نہ ہو، کرنی چاہئے۔یہ بات ان کی درست بھی ہے کہ کام خواہ کوئی بھی ہو دل لگا کر کرنے سے ہی ہوتا ہے۔اور اگر کام سیکھنا ہو تو محنت اور بار بار کی مشق سے ہی سیکھا جاسکتا ہے۔

بحیثیت مدیر الفضل:

روزنامہ الفضل کی اشاعت بوجوہ کچھ عرصہ کے لئے بند رہی۔دوبارہ اشاعت کی اجازت ملنے پر آپ مدیر مقرر ہوئے۔کٹھن مرحلہ تھا لیکن بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ نباہا۔بعض اصطلاحات کی اشاعت کی اجازت نہ تھی۔شروع میں ہمیں عجیب معلوم ہوتا کہ کہیں تو ایسی اصطلاح کا متبادل لفظ استعمال ہوا ہے اور کہیں صرف ڈیش سے کام لیا گیا ہے۔کبھی کبھی ملاقات پر اس بارے میں ذکر ہوتا تو فرماتے شائد اسی میں کوئی بہتری ہے۔ہم کہتے کہ ہمیں تو پڑھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا آپ کو لکھتے ہوئے یہ تبدیلی کیسی محسوس ہوتی ہے دل کباب ہو جاتا ہوگا۔فرماتے صبر کریں یہ وقت بھی بیت جائے گا۔ایک مرتبہ کسی نے ایک شدید قسم کا تنقیدی خط لکھا اور ساتھ ہی چیلنج دیا کہ یہ خط آپ شائع نہیں کریں گے۔لیکن انہوں نے یہ خط من وعن شائع کیا۔ہمت کی بلندی کے ساتھ حوصلہ بھی بلند تھا۔کبھی کبھار لکھنے کا خیال آتا تو کوئی مضمون لکھ کر بھیج دیتا اور ساتھ لکھ دیتا کہ اگر معیار کے مطابق ہو تو شامل اشاعت فرمادیں۔آپ شائع فرماتے اور جب ملاقات ہوتی تو فرمائش ہوتی کہ مضمون لکھ کر بھیجا کرو گویا کہ حوصلہ افزائی فرماتے لیکن ہم کہ کم گو اور کم آمیز ہونے کے ساتھ ساتھ کم کم ہی لکھتے لیکن جب بھی لکھا اخبار کے صفحات کی زینت ضرور بنا۔

مجازی خدا:

ایک شادی کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے مجازی خدا والے عرف عام محاورے کی تشریح کرتے

ہوئے فرمایا کہ خاوند کو عرف عام میں مجازی خدا کہا جاتا ہے جس سے یہ تصور ابھر کے سامنے آتا ہے کہ بیوی کو اپنے خاوند کی اطاعت وفرمانبرداری دل کی گہرائیوں سے کرنی چاہئے اور اس کی پوری عزت واحترام کرنا اس پر لازم اور فرض ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں سوچا جاتا کہ خاوند کو اگر مجازی خدا کہا گیا ہے تو اس پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اسے بھی اپنا مقام اور ذمہ داریاں پوری طرح ادا کرنا چاہئیں۔ مثلاً خدا بن مانگے دیتا ہے اور مانگنے پر بھی دیتا ہے۔ اس لئے خاوند اگر کبھی کبھار بغیر کسی مطالبہ کے بیویوں کو تحفہ وغیرہ لا کر دیں اور اگر کوئی مطالبہ ہو تو بھی پورا کریں تو گھریلو شکایات کم سے کم پیدا ہوں گی اور آپس کی الفت میں اضافہ ہو گا۔ اور اس طرح گھر جنت کا ماحول پیش کرے گا۔

مکرم سیفی صاحب کی یہ چند باتیں جو سبق آموز ہیں افادہ عام کے لئے تحریر کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے۔ آمین۔

4- چند میدان عمل کے ہمرکاب:

پچاس کی دہائی کا آخری سال رواں دواں تھا۔ جامعہ کی تعلیم کے مراحل طے ہو چکے تھے۔ وکالت تبشیر کی طرف سے تقرر سیرالیون، مغربی افریقہ کے لئے ہو چکا تھا روانگی کی تیاری ہو رہی تھی۔ ولولہ تازہ تھا اور اب وہ وقت جب یاد آتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ:

؎ یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

شیخ نصیر الدین احمد:

سیرالیون میں ان دنوں شیخ نصیر الدین مربی انچارج تھے وہاں پہنچنے پر ان سے تعارف ہوا۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی کچھ عرصہ ان کے ساتھ بلکہ ان کے ماتحت کام کیا۔ چونکہ عملی کام میں یہ میرا پہلا تجربہ تھا اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ وہ عملی کام میں میرے لئے اولین استاد تھے تو غلط نہ ہوگا۔ ان ایام میں سن ساٹھ کے عشرہ کے شروع میں مشن تعلیمی میدان میں ترقی پذیر تھا۔ سیکنڈری سکول کھولنے کی منظوری حکومت سیرالیون کی طرف سے مل چکی تھی لیکن سکول کی عمارت ابھی تک تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے بو (Bo) شہر کے مقامی مشن ہاؤس کے ایک کمرہ میں کلاس شروع کر دی گئی تھی اور سکول کی تعمیر کم و بیش اپنی مدد

آپ کی بنیاد پر ہو رہی تھی اور شیخ صاحب اس سارے کام کے روح رواں تھے اور ساتھ ساتھ بطور ٹیم کے چوہدری سمیع اللہ سیال صاحب، مولوی محمد صدیق گورداسپوری اور مقامی احباب میں سے پاروجرز اور پا سیدو کام کر رہے تھے چند ماہ میں کم سے کم ضروریات کی عمارت جس میں سکول جاری کیا جا سکے تیار ہو گئی اور کلاسیں نئی عمارت میں منتقل ہونے پر عمارت کی تعمیر سے مشروط منظوری مستقل منظوری قرار پائی نیز مزید سکول کھولنے کی منظوری کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ شیخ صاحب موصوف کو تدریس سے خاص شغف تھا۔ تدریس وارشاد کے کام رواں دواں تھے اور ان کے ساتھ کام کرتے کچھ عرصہ ہی گذرا تھا کہ انہیں واپس مرکز میں پہنچنے کی ہدایت موصول ہوئی اور ان کی جگہ مکرم بشارت احمد بشیر صاحب تشریف لائے اور ان کے ساتھ کام کرتے کچھ عرصہ ہی گذرا تھا کہ ایک سفر کے دوران ایک حادثہ سے دو چار ہوئے۔

مکرم بشارت احمد صاحب:

مکرم بشارت احمد نیر صاحب گونا گوں خوبیوں کے مالک تھے مرنج مرنجاں طبیعت پائی تھی۔ مرکز میں انتظامی عہدوں پر کام کر چکے تھے اس کے علاوہ اس مرتبہ بیرون ملک جانے سے قبل بھی بیرونی ملکوں میں کام کا تجربہ رکھتے تھے۔ سیرالیون مشن کا چارج لیتے ہی انہوں نے بڑے زور شور سے کاموں کو آگے بڑھانا شروع کر دیا۔ نئے سکول جاری کرنے کا جائزہ لیا اور کام شروع کر دیا۔ مجھے سکولوں کے کام میں اپنے ساتھ لگا لیا۔ پہلے بو سکول کا ہیڈ ماسٹر مقرر کر کے حکومت سیرالیون سے نہ صرف منظوری حاصل کی بلکہ دیگر مراعات مثلاً تنخواہ کی منظوری لینے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ پھر مجھے سارے سیرالیون کے احمدیہ سکولوں کا منتظم مقرر کر دیا۔ اساتذہ کا تقرر و تبادلہ ان کی تنخواہوں کی ادائیگی، حکومت سے ان تنخواہوں کی وصولی، نئے اساتذہ بھرتی کرنا وغیرہ تمام کام مجھے سونپ دئے گئے۔ انہوں نے سکولوں کی عمومی نگرانی ہی کا اختیار اپنے پاس رکھا تا وہ مشن کے دیگر کاموں اور دعوت الی اللہ کے کام کو یکسوئی سے انجام دے سکیں۔

تین سال گذر گئے:

کام کام اور پھر کام۔ دعوت الی اللہ کا کام، سکولوں کے کام اور پھر ان کاموں کی سرانجام دہی کے لئے مختلف علاقوں کے دورے، میٹنگز جلسے اور تربیت وغیرہ کے کام۔ تین سال یوں گذر گئے کہ پتہ بھی نہ چلا

اس دوران جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے دو یا تین نئے سکول بھی قائم ہوئے۔ حسب قواعد تحریک جدید تین سال کا عرصہ پورا ہونے پر مرکز میں واپسی ہوتی تھی۔ لہٰذا واپس پاکستان جانے کی ہدایت ہوئی۔

سیرالیون سے روانگی:

ان ہی دنوں مکرم حافظ بشیر الدین عبید اللہ صاحب کی واپسی کا پروگرام بنا۔ انہوں نے مرکز سے درخواست کی کہ انہیں براستہ لندن بحری جہاز سے سفر کی اجازت دی جائے کیونکہ ان کا بیٹا لندن میں ہے جس سے وہ ملنا چاہتے ہیں۔ اجازت ملنے پر انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں بھی اجازت کی درخواست کروں تا اکٹھے سفر کی سہولت میسر آ سکے۔ درخواست دینے پر مجھے بھی منظوری مل گئی۔ چنانچہ ہم دونوں نومبر 63ء میں بحری جہاز کے ذریعہ روانہ ہو کر نو دن کے مسلسل سفر کے بعد لندن مشن ہاؤس پہنچے۔ لندن میں تقریباً ایک ماہ قیام رہا۔ وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز دسمبر 63ء کے جلسہ سالانہ شروع ہونے سے چند روز قبل ربوہ پہنچے اور جلسہ کی برکات سے مستفید ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

حافظ بشیر الدین عبید اللہ صاحب:

مکرم حافظ صاحب کا ذکر آ گیا تو کچھ ان کا ذکر خیر بھی ہو جائے سیرالیون میں خدمت بجالانے سے قبل وہ مختلف ممالک میں کام کر چکے تھے۔ اس طرح میدان عمل کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ ان سے جان پہچان تو پہلے سے تھی لیکن اکٹھے کام کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اب جبکہ ایک ملک میں کام کرنے اتفاق ہوا اور میل ملاقات بڑھی تو یوں محسوس ہوا کہ گویا پرانے دوست ہیں۔ دوست باش، طبیعت میں شگفتگی اور چال دھیمی مگر باوقار۔ طریق کار میں نمایاں وصف یہ تھا کہ ذاتی تعلقات استوار کرنے میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ ضروری کاموں سے فراغت کے بعد شیروانی زیب تن کرتے اور بازار کا رخ کرتے۔ دوکاندار سے اشیاء کی قیمتیں پوچھتے اور اس انداز سے بات کرتے کہ گویا پہلے سے جان پہچان ہے۔ دوکاندار کو یہ محسوس نہ ہونے دیتے کہ وہ خریدار نہیں ہیں بلکہ یوں ہی اشیاء کی قیمتیں معلوم کر رہے ہیں پھر آہستہ آہستہ اپنا تعارف کرواتے اور اپنے کام کی نوعیت واضح کرتے۔ پھر اگلی دوکان کا رخ کرتے۔ اس طرح احباب کا حلقہ وسیع کرتے اور پھر موقعہ ملنے پر انہیں دعوت الی اللہ کرتے ہم نے کم و بیش ڈیڑھ ہفتہ کا بحری سفر اکٹھے کیا اور

لندن میں بھی قیام رہا لیکن کسی لمبی [illegible] نہیں ہوا کہ وہ مجھ سے بہت سینئر ہیں اور عمر میں بھی تفاوت ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا کہ گویا ہم عمر اور ہم جولی ہیں۔ مرکز میں پہنچنے پر ہمارے میدان عمل الگ الگ ہو گئے۔ پھر کبھی اکٹھے کام کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جب زیمبیا میں خدمات بجالانے کے بعد 79ء میں واپس ربوہ آیا تو وہ ربوہ میں تھے۔ ملاقات پر خوش باش نظر آئے تاہم بتایا کہ انہیں دل کا عارضہ ہے۔ اسی سال خدام الاحمدیہ کے اجتماع کا غالباً آخری روز ہم اجتماع کے میدان میں ملے اکٹھے پروگرام سنا اور اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔ اگلی صبح کسی نے بتایا کہ حافظ صاحب دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ یقین نہ آیا کیونکہ انہیں تندرست اور خوش و خرم دیکھے ابھی بارہ گھنٹے بھی نہیں بیتے تھے لیکن میرے یقین نہ کرنے سے ان کی حیات مستعار واپس تو نہیں آ سکتی تھی۔ بالآخر یہی کہنا پڑا ''ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''